
نقشِ قدم
بلقیس کنول

کیاعرض کروں

اس پُر آشوب دور میں جب رومانی اور افسانوی ادب کی بات کرنا بھی بے ادبی سمجھا جاتا ہو' محترم عبدالغفار صاحب نے "علی میاں پبلی کیشنز" سے میرا ناول "نقشِ قدم" شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بڑی ہمت' بڑی حوصلہ افزائی کی بات ہے۔

اپنے قلم سے اپنی ہی نگارشات کے بارے میں کچھ لکھنا بڑا کٹھن کام ہے۔ میں نے کترانے کی کوشش کی' ناشر کا اصرار بڑھتا گیا۔ مجھے مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنے پر آمادگی کا اظہار کرنا پڑا۔

"نقش قدم" کے بارے میں حتمی رائے بہرحال قارئین کی ہو گی۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس ناول کی ہیروئن بڑی حساس طبیعت کی مالک ہے' اس آئینہ کی مانند جو ہر عکس بڑی جلدی قبول کر لیتا ہے۔ پھولوں سے لدی اس نرم و نازک ٹہنی کی طرح جو زیادہ بوجھ نہیں سہار سکتی' بڑی جلدی چٹخ جاتی ہے۔ اس کی تربیت گھر کی چہار دیواری کے اندر خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ زمانے کی رفتار' سرد و گرم سے ناواقف تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے آئینے میں ماں کے ماضی کا ایک دھندلا سا عکس دیکھ لیا۔ اس کے معصوم ذہن میں ایک خوف نے بسیرا کر لیا جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے نقش گہرے کرتا رہا۔

رت بدلی' موسم نے انگڑائی لی۔ ڈولی میں بیٹھ کر پیا گھر جانے کا وقت آ گیا۔ اس کی سکھیاں' ہمجولیاں باہر صحن میں بیٹھی ڈھولک کی تھاپ پر خوشیوں کے گیت الاپ رہی تھیں۔ وہ اندر پھولوں کی سیج پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔

"میری سکھیاں میری بربادی کے آغاز پر مسرتوں کا اظہار کیوں کر رہی ہیں؟"

"کیا پت جھڑ کے موسم میں بھی بہار کے نغمے گائے جاتے ہیں؟"

وہ ایسا کیوں سوچ رہی تھی؟ اس کا جواب آپ کو "نقشِ قدم" پڑھتے ہوئے قدم قدم پر ملے گا۔

اپنے بارے میں بھی عرض کرتی چلوں کہ ماہنامہ "پاکیزہ" میں میرے کم و بیش تین ناول بہ عنوان "تشنہ لب"، "دھند" اور "سیپ" (قسط وار) شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی چار مجلد ناول قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ افسانوں کی تعداد ان گنت ہے۔

ماہنامہ "پاکیزہ" خواتین کے تمام ماہناموں میں صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ "پاکیزہ" کی خواتین کا وسیع حلقہ میرے نام سے بخوبی واقف ہے۔ مجھے یقین ہے وہ "نقشِ قدم" کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گی۔

"نقشِ قدم" کے سلسلے میں آپ کی قیمتی آراء اور بے لاگ تبصروں کی منتظر۔

بلقیس کنول

بادل کُھل کر برس چکے تو موسم کا حُسن نکھر آیا۔

ہر شے پر نکھار ہی نکھار نظر آ رہا تھا' زمین کی پیاس بجھی تو گرمی کی تپش بھی کم ہو گئی' سوکھے مرجھائے پودوں میں ایک نئی زندگی کی اُمنگ نظر آنے لگی۔ بڑے بڑے تناور درخت جو کئی دنوں سے سر اُٹھائے آسمان کی طرف نظریں جمائے تھے موسم کی کروٹ پر خوشی سے جُھوم جُھوم اٹھے۔ فضا میں ہلکی خنکی آ چکی تھی۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے اب بھی کہیں کہیں تیرتے نظر آ رہے تھے۔ غرضیکہ موسم کی انگڑائی نے ماحول کو ایک نئی زندگی بخش دی تھی۔ زندگی............

جس میں حُسن تھا............

نئی نئی امنگیں تھیں............

لیکن عاصمہ اس وقت بھی اداس اداس سی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب سلاخوں سے لگی کھڑی آسمان کے دُور پار خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اُس کا حُسن کس قدر سوگوار سوگوار سا لگ رہا تھا لیکن اس سوگواری میں بھی تمام تر رعنائیاں موجود تھیں۔

قدرت نے اس کو اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا تھا' حُسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا' خوبصورتی کے تمام خزینے اس کے پیکرِ خاکی میں بھر دیئے تھے لیکن اس کے ہونٹوں سے بس ایک مسکراہٹ چھین لی تھی۔

بادل جب گِھر گِھر کر آ رہے تھے تو عاصمہ کا معصوم دل خدا سے یہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اے کاش آج بھی ان اُودے اُودے بادلوں کی ٹکڑیاں بِن برسے کہیں اور چلی جائیں۔ گرمی کی شدت بدستور قائم رہے اور فضا کا تمام حُسن' زندگی کی تمام مسرتیں اور دل کے ہر ولولے یوں ہی دل میں گُھٹ گُھٹ کر دم توڑ دیں۔ ہر شے گرمی کی تپش سے جھلس کر رہ جائے۔

اپنا ظاہری حُسن کھو دے ....

برباد ہو جائے ....

تباہ ہو جائے ....

فنا ہو جائے تاکہ بقا کی کوئی اُمید باقی نہ رہے۔

لیکن ....

ان اُودے اُودے بادلوں نے تو جیسے عاصمہ کی دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی تمناؤں کا مذاق اڑانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں کی ٹکڑیاں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برسے تھے' بجلیاں کوندی تھیں اور گھن گرج شروع ہو گئی تھی۔

عاصمہ اپنے پلنگ پر بیٹھی موسم کی اس نئی کروٹ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی' تکتی رہی اور پھر جب بادل کُھلے اور آسمان کا حُسن کسی کنواری دوشیزہ کی معصومیت کی طرح پاکیزہ پاکیزہ سا نظر آنے لگا تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل کر فضا کے ہنگاموں میں گم ہو گئی۔

تھکے تھکے انداز میں وہ بستر سے اٹھی' کھڑکی کے قریب آ کر رُکی اور آسمان کے دُور پار خلاؤں میں جھانکنے لگی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں درد و غم کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ پلکوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرے موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور دل کی دھڑکنوں میں ایک آرزو مچل رہی تھی۔

وہ بھی ان بادلوں کی طرح برس پڑے ....

اتنا روئے کہ پھر رونے کی تمنا باقی نہ رہے .... اور

اس کے آنسوؤں میں ہر شے غرق ہو کر رہ جائے ....

ہر خوشی سسک سسک کر دم توڑ دے ....

ہر ارمان گھٹ گھٹ کر رہ جائے۔

سلاخوں سے لگی کھڑی وہ بہت دیر تک آسمان کو تکتی رہی' اُداس اُداس اور ویران نظروں سے گھورتی رہی پھر اچانک اس کا دل بھر آیا .... پلکوں پر تھمے تھمے بے اختیار آنسو برس پڑے .... اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا وسیع آسمان لرزنے لگا۔ ں جیسے کسی ندی کی خاموش سطح پر کسی نے کنکر پھینک دی ہو اور لہروں کے دائرے

یکلخت ابھر کر پھیلتے چلے گئے ہوں۔

عاصمہ کھڑکی کے قریب کھڑی روتی رہی' اس کی آنکھوں کے سامنے دھند پھیلتا رہا۔ کُہر کی دبیز چادر میں جیسے اس کا حال چھپ کر رہ گیا تھا جب اُس نے ماضی کے دریچوں میں جھانکا تو اس کا دل بیدِ مجنوں کی طرح کانپ اٹھا۔

ماضی ....

جس پر آج بھی تاریکی کے بھیانک سائے اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھے۔

جو بھیانک اور گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اندھیرے ....

جنہوں نے تباہی اور بربادی کو تخلیق کیا تھا اور وقت کی آندھی نے ایک ہنستے کھیلتے گھرانے کی تمام خوشیوں کو اپنے بے رحم قدموں تلے روند ڈالا تھا .... تباہ کر دیا تھا .... بربادی سے ہمکنار کر دیا تھا۔

عاصمہ کا معصوم دل تڑپ اٹھا۔ اس نے ماضی کی تلخ یادوں کو بُھلا دینے کی کوشش کی' لیکن وقت نے اس کے دل پر جو چرکے لگائے تھے جو زخم بخشے تھے وہ رفتہ رفتہ ناسور بن کر رِسنے لگے تھے۔

ناسور ....

جس کو ٹھیس پہنچتی ہے تو درد کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ دل کے پھپھولے پھُوٹیں اور جلن کا احساس نہ ہو؟

اس نے جس قدر ماضی کو بُھلانا چاہا اتنا ہی الجھتی گئی۔ اس کے ذہن میں شہنائیوں کی آواز گونجنے لگی۔ اسے آج بھی روزِ اوّل کی طرح یاد تھا جب اسے ہر وقت ہنسنے مسکرانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا .... کتنے خوشگوار تھے وہ شب و روز جب زندگی بہاروں سے ہمکنار تھی' اس کے صحن میں خوشیاں رقص کرتی تھیں' قہقہے جنم لیتے تھے .... لیکن موسم کی ایک ہی کروٹ اور وقت کی ایک انگڑائی نے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ پامال کر کے رکھ دیا۔

بارہ سال پہلے کی بات تھی ....

اس وقت عاصمہ کی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ قصرِ شبانہ پر صرف شبانہ بیگم کا راج تھا' ہر قسم کی آسائش اور ہر قسم کا آرام مہیا تھا' نوکر چاکر اور دولت کی ریل پیل تھی'

تفریح کرنے کے لئے دروازے پر دو دو موٹر کاریں موجود تھیں' رہنے کے لئے قصرِ شبانہ کی عظیم عمارت تھی۔

شیخ عارف علی کا ستارہ عروج پر تھا۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو مٹی کو چھو لیں تو سونا بن جائے۔ کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ دولت کی بہتات نے زمانے بھر کی خوشیاں خرید کر شبانہ بیگم اور عاصمہ کے قدموں میں بکھیر دی تھیں۔ ہر روز' روزِ عید تھا اور ہر شب' شبِ برأت!

شبانہ بیگم اور عارف علی کی محبت اپنی مثال آپ تھی۔ اگر کبھی شبانہ بیگم کو موسم کی تبدیلی کی وجہ سے چھینک بھی آ جاتی تو عارف علی متفکر ہو جاتے۔ ڈاکٹروں اور سرجنوں کی لائن لگ جاتی۔ کبھی عارف علی کو زکام ہو جاتا تو شبانہ بیگم بے چین ہو جاتیں۔ تمام رات شوہر کی پٹی سے لگی بیٹھی دوا علاج میں مصروف رہتیں اور عاصمہ..........

وہ ایک مہکتا ہوا شگفتہ پھول تھی جس سے قصرِ شبانہ کا گوشہ گوشہ مہک رہا تھا۔ شبانہ بیگم اور عارف علی دونوں ہی اسے دیکھ دیکھ کر جی رہے تھے۔ جب تک عارف علی گھر سے باہر اپنے کام کاج میں مصروف رہتے شبانہ بیگم اس کے ناز اٹھاتی رہتیں اور جب عارف علی آ جاتے تو وہ اس کے نخروں کو سہارا دیتے۔

زندگی کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ وقت کا پنچھی اڑتا رہا۔ عاصمہ کو ماں باپ دونوں کا پیار حاصل تھا۔ جہاں قدرت نے اسے حُسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا وہاں بلا کی ذہانت بھی دی تھی۔ چھ سال کی عمر ہی میں اس نے چار جماعتیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اسکول میں وہ ہمیشہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتی' اس کا نام ہمیشہ ہم جماعت لڑکیوں میں سرِفہرست رہتا لیکن فلک کج رفتار کو قصرِ شبانہ کی خوشیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ وقت نے کروٹ بدلی' حالات نے انگڑائی لی' تمام حقیقتیں ایک خواب بن کر رہ گئیں۔

خواب..........

جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی..........

اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن..........

کبھی پریشان خیالات کا ایک عکس.......... اور

کبھی دل کے بہلاوے کے لئے ایک حسین فریب۔

عاصمہ ہرچند کہ معصوم تھی' بچی تھی لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی خلیج ہے جو

رفتہ رفتہ اس کے والدین کے درمیان حائل ہوتی جا رہی ہے۔ اب نہ وہ پہلی جیسی مسکراہٹیں تھیں اور نہ وہ قہقہے۔ اگر کچھ تھا تو وہ محض فریبِ نظر تھا جو ٹوٹتی ہوئی رسّی کے بل کی طرح آہستہ آہستہ اپنی بندشیں کمزور کرتا جا رہا تھا۔

عاصمہ ذہین ضرور تھی لیکن وہ اس خلیج کو نہ سمجھ سکی جو رشتوں کے درمیان پیدا ہو چلی تھی۔ وہ اکثر اپنے معصوم ذہن پر زور دے کر سوچتی' اپنی معصوم صلاحیتوں کو کُرید کُرید کر وقت کی نزاکت کا احساس کرنے کی کوشش کرتی لیکن بے سود اور پھر جب ذہن تھک جاتا تو وہ شبانہ بیگم کا منہ تکنے لگتی۔

ایک دن اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا تھا..........

"امی جان! آپ ہر وقت چُپ چُپ سی کیوں رہتی ہیں؟"

جواب میں شبانہ بیگم نے کپکپاتے ہونٹوں سے اس کے معصوم ہونٹ چوم لئے' منہ سے کچھ نہ کہا لیکن عاصمہ نے دیکھ لیا تھا کہ ماں کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ تڑپ کر بولی۔

"امی جان! آپ رو رہی ہیں' کیوں رو رہی ہیں آپ؟"

شبانہ بیگم نے جلدی سے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تُو تو دیوانی ہو گئی ہے.......... پگلی کہیں کی.......... میں رو کب رہی ہوں۔"

عاصمہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"پھر.......... یہ آپ کی آنکھیں بھیگی سی کیوں ہیں؟"

شبانہ بیگم نے ٹالنے کی خاطر کہا۔

"کچھ نہیں.......... آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔"

لیکن ماں کی ممتا عاصمہ کو زیادہ دنوں تک نہ ٹال سکی۔ اس کا معصوم ذہن مطمئن نہ ہو سکا۔ وہ سوچتی' ماں کو کوئی غم ضرور ہے۔ وہ تجسّس میں رہتی اور پھر ایک دن اس نے وہ راز پا لیا جو قصرِ شبانہ پر بربادی کے منحوس بادل کی طرح منڈلا رہا تھا۔

اس روز وہ اسکول سے واپس آئی تو اس کے سر میں ہلکا ہلکا سا درد تھا۔ بستہ رکھ کر وہ سیدھی ماں کے کمرے میں گئی' پھر ماں کو تلاش کرتی ہوئی وہ باپ کے کمرے تک چلی گئی لیکن اس کے قدم دروازے پر ہی تھم کر رہ گئے۔ شیخ عارف علی کی گرجدار آواز اس کے معصوم ذہن میں بجلی بن کر کوندی تھی۔

"تم اگر ناہید کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہو تو اپنا کوئی اور بندوبست کر لو۔"

عاصمہ نے سہمے سہمے انداز میں دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا تو وہ بے چین ہو گئی۔ اس کا معصوم دل تڑپ اٹھا۔

شبانہ بیگم تصویرِ حیرت بنی شوہر کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں اور عارف علی غصے کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

"میں ناہید سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں اور تمہارے یہ آنسو میرے راستے کی دیوار نہیں بن سکتے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میرا یہ قدم تمہارے اور عاصمہ کے لئے بُرا ثابت ہو گا تو قصر شبانہ چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ .... میں تمہارے اخراجات برداشت کرتا رہوں گا۔"

جواب میں شبانہ بیگم کی آواز رندھ گئی۔

"مجھے دولت کی نہیں، آپ کی ضرورت ہے۔"

عارف علی نے منہ پھیر کر کہا۔

"اور مجھے ناہید کی ضرورت ہے۔"

عاصمہ دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔ ماں کے آنسو دیکھ کر وہ خود بھی رو پڑی تھی لیکن آج عارف علی کا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عاصمہ کے آنسو نہیں پونچھے، اسے پیار سے چمکارا نہیں، سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر سینے سے نہیں لگایا۔

آخر مرد جو تھے..........

مرد..........

جو آہنی عزائم کا مالک ہوتا ہے..........

جو چٹانوں سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا ہے..........

جو طوفانوں کا منہ پھیر دیتا ہے .... پھر

ایسے مرد کے سامنے بھلا ایک ایسی عورت کی کیا حقیقت تھی جسے قدرت نے اس کے رحم و کرم پر ڈال دیا تھا۔

ان آنسوؤں کی بھلا کیا حیثیت تھی جو ایک عورت کی آنکھوں سے اس کی مجبوری بن کر ٹپک گئے تھے۔

شبانہ بیگم نے عاصمہ کو سسکتے دیکھا تو اسے سینے سے لپٹا کر شوہر کے کمرے سے باہر آ گئیں اور پھر کچھ دنوں بعد قصرِ شبانہ سے بھی نکل کر خدا کی وسیع دنیا میں اپنے لئے سر

چھپانے کا ایک الگ بندوبست کر لیا۔ عاصمہ اس روز بلک بلک کر روئی تھی، تڑپ تڑپ کر مچلی تھی لیکن سنگ دل باپ کا پتھر دل نہیں پسیجا اور وہ باپ کی شفقتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔

شبانہ بیگم نے جب شوہر کی دہلیز سے قدم باہر نکالا، اس وقت وہ پورے دنوں سے تھیں۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے عارف علی کی آخری محبت کو آصف کی شکل میں جنم دیا اور زندگی کے نئے ہنگاموں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

زندگی کے بارہ سال یوں بیت گئے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ شبانہ بیگم نے اپنے جہیز کی چیزیں بیچ بیچ کر اپنے فرائض کو پورا کیا۔ عاصمہ نے وقت کی نزاکت کو سمجھا تو پڑھائی میں محو ہو گئی۔ وہ ماں کا سہارا بن جانا چاہتی تھی۔ قدرت نے اس مسئلے میں اس کی مدد کی اور عاصمہ نے بی اے کر لیا۔

تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اس نے لڑکیوں کے اسکول میں ملازمت کر لی اور اخراجات میں ماں کا سہارا بن گئی۔ اس کا بیشتر وقت گھر کے کام کاج میں صرف ہوتا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ غموں کو سہتے سہتے ماں کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو ماں کے تمام غم خود اپنا لیتی لیکن یہ محض جذباتی لگاؤ کی باتیں تھیں۔ وہ ماں کا غم نہ بانٹ سکی، لیکن اس کی پریشانیوں کو کچھ حد تک کم کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئی۔

صبح اٹھ کر وہ جلدی جلدی ناشتہ کرتی۔ آصف کو اسکول بھیج کر خود ملازمت پر چلی جاتی پھر تھکی ہاری لَوٹتی تو گھر کے کام میں اُلجھ جاتی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ عاصمہ کا خیال تھا کہ ماں کے دل کے زخموں پر صبر کا پھاہا لگ چکا ہے لیکن ایک دن اس کا یہ سکون بھی چھن گیا۔

اس روز ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ شبانہ بیگم کو ٹی بی ہو گئی ہے لیکن مرض ابھی پہلے اسٹیج میں ہے اور یہ کہ اگر انہیں فوری طور پر سینی ٹوریم میں داخل نہ کرایا گیا تو مرض لاعلاج ہو جائے گا۔

عاصمہ نے یہ سنا تو اس کا دل تڑپ اٹھا لیکن اس نے اپنے آنسو پی ڈالے، اسے خدشہ تھا کہ اگر بھائی کو حالات کا علم ہوا تو وہ بھی پریشان ہو جائے گا لیکن حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ان کی پردہ پوشی شبانہ بیگم کے لئے مہلک بن جاتی۔

کچھ روز تک وہ سوچتی رہی۔ تنہائی میں آنسو بہاتی رہتی۔ پھر ایک روز اس نے ماں کو سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا۔ شبانہ بیگم نے انکار کیا مگر جب عاصمہ نے اپنی زندگی کا واسطہ دلایا تو ماں کی ممتا انکار نہ کر سکی۔ اس روز ماں کے سہاگ کی آخری نشانی وہ ٹیکہ بھی بِک گیا جو کبھی ان کی افشاں بھری مانگ میں موتیوں کی لڑی میں پرویا گیا تھا اور ایک دلہن کی پیشانی پر اُمنگوں کا سورج بن کر چمکا تھا۔

اُمنگوں کا سورج ....

جو طلوع ہو کر کتنی جلدی غروب ہو گیا تھا............

روشنی کے سائے کس قدر جلد اندھیروں میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔

اور یہ سب ایک باپ کی بدلی ہوئی نگاہوں کا نتیجہ تھا۔ ایک مرد کے آہنی عزائم کی پیداوار تھی جس نے ایک وفا شعار عورت کو ٹھکرا کر دوسری عورت کو اپنا لیا تھا۔

مرد..........

مرد..........

مرد..........

عاصمہ کو جیسے اس لفظ سے نفرت ہو گئی تھی .... شدید نفرت..........!

☆======☆======☆

شبانہ بیگم کو سینی ٹوریم میں داخل ہوئے چار ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا لیکن ان کی حالت ابھی تک مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ انہیں مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کچھ دن اور لگیں گے۔

عاصمہ کے کاندھوں پر قدرت نے جو بوجھ ڈالا تھا وہ اُسے بڑی بُردباری سے اٹھائے ہوئے تھی۔ ایک طرف اسے ماں کی بیماری کی فکر لاحق تھی اور دوسری طرف آصف کا خیال تھا جو میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

بڑھتے ہوئے اخراجات کے تحت اس نے اپنے پڑوس میں دو بچوں کو پڑھانے کے لئے ٹیوشن کر لیا تھا۔ دو سو روپے اسکول سے مل جاتے تھے اور ٹیوشن سے اَسّی روپے ملتے تھے۔ عاصمہ اسی قلیل رقم سے گھر کا خرچ اور ماں کی بیماری کے اخراجات سنبھالے ہوئے تھی۔

سینی ٹوریم کا ڈاکٹر خدا ترس آدمی تھا اس لئے اس نے بھی شبانہ بیگم کے علاج میں

نہ صرف یہ کہ زیادہ توجہ دی تھی بلکہ دوا دارو میں بھی عاصمہ کے ساتھ خاص رعایت کر دی تھی۔

عاصمہ کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں' لیکن اس کے باوجود وہ ماں کو دیکھنے کے لئے بڑی پابندی کے ساتھ ہر دوسرے دن سینی ٹوریم جایا کرتی تھی۔ آصف اس کے ساتھ ہوتا مگر جب سے امتحانات کی تیاریاں شروع ہوئی تھیں وہ زیادہ تر گھر پر ہی پڑھائی میں مصروف رہتا' عاصمہ تنہا چلی جایا کرتی۔

آج بھی اس نے شام کا کھانا تیار کر کے آصف کو دیا پھر اسے پڑھنے کی ہدایت کر کے سینی ٹوریم روانہ ہو گئی۔ راستے سے اس نے ماں کے لئے حسبِ حیثیت تھوڑے فروٹ لے لئے تھے۔

شبانہ بیگم کو شروع شروع میں جنرل وارڈ میں رکھا گیا تھا لیکن جب سے ان کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی بڑے ڈاکٹر کی سفارش پر انہیں سرونٹ کوارٹرز کے قریب ایک کمرہ دے دیا گیا تھا۔

عاصمہ جب پھلوں کا تھیلا اٹھائے ماں کے کمرے میں داخل ہوئی تو شبانہ بیگم نے معمول کے مطابق مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کا خیر مقدم کیا۔ عاصمہ نے تھیلا میز پر رکھا اور دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

ماں نے اس کے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"عاصمہ! آصف کئی روز سے نہیں آیا۔"

عاصمہ نے ماں کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"امی جان! آج کل وہ امتحانات کی تیاریوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ میں جان بوجھ کر اسے ساتھ نہیں لائی۔ اگلی بار ضرور لے آؤں گی۔"

شبانہ بیگم نے عاصمہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھا پھر بولیں۔

"تمہیں میری خاطر اس کم سنی میں کس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔"

عاصمہ نے شکایت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"امی جان! پھر وہی بات شروع کر دی آپ نے۔ آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں تو میں سمجھوں گی مجھے سب کچھ مل گیا۔"

شبانہ بیگم نے اسے دعا دیتے ہوئے کہا۔

"خدا آصف کو کسی قابل کر دے تو تمہاری دشواریاں کچھ کم ہو جائیں گی۔"

"دشواری کی کیا بات ہے امی جان!" عاصمہ بولی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا' آپ کچھ نہ سوچا کریں۔"

شبانہ بیگم کچھ توقف کے بعد بولیں۔

"ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ابھی مجھے دس پندرہ روز اور یہاں رہنا ہو گا۔"

"احتیاط کے طور پر یہ ضروری ہے .... ویسے اب تو خدا کے فضل و کرم سے آپ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"دق کے مریض کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بیٹی!"

"امی جان!" عاصمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب اگر آپ نے کچھ کہا تو میں رو پڑوں گی۔"

شبانہ بیگم مجبوراً مسکرا دیں لیکن اس مسکراہٹ کے پیچھے نہ جانے کتنے درد مچل رہے تھے۔

عاصمہ کی ضد کے آگے وہ مجبور ہو کر سینی ٹوریم میں داخل ہو گئی تھیں لیکن وہ اکثر سوچا کرتیں کہ اگر خدانخواستہ ان کی کشتیٔ حیات بیچ منجدھار میں ڈوب گئی تو کیا ہو گا۔ انہیں جہاں شوہر کی بے وفائی کا صدمہ تھا وہاں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ کسی طرح عاصمہ کے ہاتھ پیلے کر دیں تاکہ فرض کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔

ڈاکٹروں کی توجہ اور سینی ٹوریم کی کھلی فضا نے ان کی صحت پر خوشگوار اثر ضرور ڈالا تھا لیکن اس غم کا علاج بھلا کون کرتا' جو اندر ہی اندر انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

وہ اکثر تنہائی میں سوچا کرتیں اگر عاصمہ اور آصف کے سر پر باپ کا ہاتھ ہوتا تو وہ یوں دربدر نہ ہوتے۔ انہیں ہر قسم کا آرام اور ہر قسم کی آسائش میسر ہوتی' لیکن سوچوں کے یہ زاویے خود بخود سمٹ کر محدود ہوتے چلے جاتے۔ حالات نے انہیں اس درجہ مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی خانہ بربادی پر کھل کر آنسو بھی نہیں بہا سکتی تھیں۔ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتیں۔ وہ اپنی کیفیت کو ڈاکٹروں سے زیادہ سمجھ رہی تھیں۔ انہیں علم تھا کہ دوا علاج نے وقتی طور پر انہیں سنبھالا دے رکھا ہے لیکن دل کا درد جب حد سے گزر جائے گا تو پھر دوا اور علاج دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور اسی خوف کی وجہ سے وہ خدا سے اپنی زندگی کی بس اتنی مہلت چاہتی تھیں کہ عاصمہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ آصف اپنے پیروں

پر کھڑا ہو جائے اس کے بعد وہ بڑی خوشی سے موت کو سینے سے لگا لینے پر آمادہ ہو جاتیں۔

عاصمہ کے جواب پر انہوں نے مجبوراً ہنسنے کی کوشش کی تو ایک پھیکے سے بے جان تبسم نے ان کے ہونٹوں پر تڑپ کر دم توڑ دیا۔ کچھ دیر عاصمہ کو ممتا بھری نظروں سے دیکھتی رہیں پھر دبی زبان میں بولیں۔

"کل نسیمہ بیگم پھر آئی تھیں' مجھے دیکھنے۔ ڈھیر سارے پھل بھی ساتھ لائی تھیں۔"

عاصمہ نے نسیمہ بیگم کا نام سنا تو ہونٹ چبا کر رہ گئی۔

وہ ماں کی بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ نسیمہ بیگم ماں کے پاس کس مقصد سے چکر لگا رہی ہیں۔ پہلے بھی کئی بار وہ دبی زبان میں اپنے لڑکے ثاقب کے لئے عاصمہ کا رشتہ مانگ چکی تھی لیکن شبانہ بیگم نے اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے انہیں ٹال دیا تھا۔ خود عاصمہ بھی اپنے رویے سے اس بات کا خاموش اظہار کر چکی تھی کہ وہ یہ شادی نہیں کرے گی۔

اس وقت ماں نے نسیمہ بیگم کا ذکر چھیڑا تو نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ماں کی بیماری کے پیشِ نظر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جلدی سے اٹھ کر سیب نکالا اور اسے کاٹ کاٹ کر ماں کو کھلانے لگی۔

شبانہ بیگم کو زمانے کے نشیب و فراز نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ عاصمہ کے چہرے کی کیفیت بھانپ رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ عاصمہ جان بوجھ کر اپنی شادی کے تذکرے سے پہلو تہی کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ رہیں پھر انہوں نے دوبارہ کہا۔

"آج کل کی دنیا میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے بیٹی! یہ نسیمہ بیگم کا حُسنِ اخلاق ہے کہ وہ مجھ سے ملنے چلی آتی ہیں ورنہ سینی ٹوریم کا نام سن کر ہی بڑے لوگ ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔"

عاصمہ نے چونک کر ماں کو دیکھا پھر بات بنا کر بولی۔

"امی جان! آپ ہر وقت کمرے میں پڑی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی اٹھ کر باہر بھی ٹہل لیا کریں۔ ڈاکٹر صاحب پچھلی بار مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کے لئے تھوڑی بہت چہل قدمی اشد ضروری ہے۔"

شبانہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

"ڈاکٹر نے مجھے بھی یہی تجویز پیش کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں' اس میں بھلا انکار کا کیا پہلو تھا؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"باہر اور بھی بہت سارے لوگ رہتے ہیں۔ میں بھلا دوسروں کے سامنے باہر کیسے نکل سکتی ہوں۔"

عاصمہ کو ماں کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں امی جان! اوّل تو ڈاکٹر کا مشورہ آپ کے لئے علاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس عمر میں اگر تھوڑی سی بے پردگی ضرورتاً ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟"

"نہیں بیٹی!" شبانہ بیگم سنجیدگی سے بولیں۔ "جب آج تک میں سختی سے پردے کی پابند رہی ہوں تو اب آخری عمر میں.........."

عاصمہ تڑپ کر بولی۔

"امی جان! آپ کو میری جان کی قسم جو آپ پھر کبھی ایسے کلمے زبان پر لائیں۔"

شبانہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میں تو ایک عام بات کہہ رہی تھی۔"

عاصمہ ضد پر اتر آئی۔

"کچھ بھی ہو.......... آپ کو میری خاطر ڈاکٹر کا مشورہ ماننا پڑے گا۔"

"اچھا بابا.......... اگر تم کہتی ہو تو کچھ دیر ٹہل لیا کروں گی۔"

اور ماں کے جواب پر اس کا معصوم دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے جھک کر ماں کی پیشانی کو بڑی عقیدت سے چوم کر کہا۔

"امی جان! آپ کتنی اچھی ہیں۔"

شبانہ بیگم نے عاصمہ کو ہنستے دیکھا تو دوبارہ نسیمہ بیگم کے ذکر کو چھیڑ دیا۔

"جانتی ہو نسیمہ بیگم کیوں چکر لگا رہی ہیں میرے پاس۔"

"مجھے کیا معلوم۔" عاصمہ نے جواب دیا۔

"ثاقب بڑا نیک اور اچھا لڑکا ہے۔" شبانہ بیگم بولیں۔ "کل ہی نسیمہ بیگم بتا رہی تھیں کہ اب اس کی تنخواہ گیارہ سو روپے ہو گئی ہے۔ سرکاری ملازمت جو ٹھہری۔ آئے دن ترقی ہوتی رہتی ہے۔"

عاصمہ نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"ہو گا!.......... ہمیں دوسروں سے کیا لینا۔ وہ اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر۔"

شبانہ بیگم بولیں۔

"یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہو تم' مگر میں سوچتی ہوں کہ ثاقب ہر لحاظ سے بڑا اچھا لڑکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ.........."

عاصمہ جانتی تھی کہ ماں اس کے آگے کیا کہنے والی ہے' چنانچہ جلدی سے بولی۔

"امی جان! آصف کہہ رہا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔"

"اللہ اس کی زبان مبارک کرے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پائلٹ بنے تو زیادہ اچھا ہے۔ فوجی زندگی انسان کو حب الوطنی سکھاتی ہے۔"

"میٹرک کر لینے دو اسے پہلے پھر دیکھا جائے گا۔"

عاصمہ نہیں چاہتی تھی ماں دوبارہ ثاقب کا تذکرہ کرے' چنانچہ اس نے کہا۔

"امی جان! آپ جس روز گھر آئیں گی' اس روز میں میلاد شریف کروں گی۔"

"ضرور کرنا.......... لیکن میں سمجھ رہی ہوں کہ تم میری بات کو ٹالنا چاہتی ہو۔"

عاصمہ نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر گردن جھکا لی۔

"عاصمہ بیٹی!" شبانہ بیگم نے پیار سے کہا۔ "میں نے آج تک تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا' لیکن آج میں بھی تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

عاصمہ کا دل کسی انجانے خوف کے احساس سے دھڑک اٹھا' کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتی ہیں؟"

شبانہ بیگم نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"زندگی اور موت کا کوئی اعتبار نہیں۔ خدا کی دی ہوئی زندگی ہمارے پاس ایک مقدس امانت ہے' وہ جب چاہے اس امانت کو واپس لے سکتا ہے۔"

"امی جان! پھر شروع کر دی آپ نے وہی بات۔" عاصمہ نے جواب میں روٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تو دنیا کی ایک عام بات کہہ رہی ہوں۔" شبانہ بیگم بولیں۔ "ماں ہونے کی حیثیت سے میری یہ تمنا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے تمہارے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

"پہلے آپ اچھی ہو جائیے پھر دیکھا جائے گا۔" عاصمہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"نسیمہ بیگم کا اصرار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔" شبانہ بیگم نے دبی زبان میں کہا۔

"پہلے میں نے انہیں ٹال دیا تھا لیکن شاید وہ میرے دل کی بات سمجھ گئی ہیں۔ کل انہوں نے کھلے الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں صرف لڑکی چاہئے۔ جہیز وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

عاصمہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"ثاقب ہمارا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ پھر یہ کہ رشتہ بھی اچھا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ تمہارے فرض سے جتنی جلدی سبکدوش ہو جاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اب میں آپ کو بوجھ محسوس ہونے لگی ہوں۔" عاصمہ نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو شبانہ بیگم ہنس کر بولیں۔

"کیسی دیوانوں جیسی باتیں کر رہی ہو .... بھلا میں اور تم کو بوجھ سمجھوں گی۔"

"پھر آپ مجھے اپنے سے دور کیوں کرنا چاہتی ہیں۔" عاصمہ کی دراز پلکوں پر آنسو کے قطرے جھلملانے لگے۔

"اے لو .... اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے .... اور پھر آخر میں کب تک تم کو کولھے سے لگائے بیٹھی رہوں گی۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں اپنے اصلی گھر جانا ہی ہے۔"

عاصمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"جب اپنا گھر موجود ہے تو پھر دوسروں کے ہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں پگلی۔" شبانہ بیگم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا اپنا گھر وہی ہو گا جہاں تم بیاہ کر جاؤ گی۔"

"اور پھر ایک دن آپ ہی کی طرح اپنے گھر سے نکال دی جاؤں گی۔" عاصمہ روانی میں کہہ گئی۔ "مجھے اپنے گھر پر کوئی حق نہ ہو گا۔ میں بھی دربدر کی خاک چھانتی پھروں گی اور پھر شاید قصرِ شبانہ کی طرح میرے مکان پر بھی کسی اور نام کی تختی آویزاں کر دی جائے گی اور.........."

اور عاصمہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ماں کے چہرے پر اچانک ابھر آنے والی

پژمردگی نے اسے اپنی حماقت کا احساس دلا دیا تھا۔ اسے ماں کے سامنے گزری ہوئی یادوں کو نہیں دہرانا چاہئے تھا۔

عاصمہ نے جلدی سے اپنا منہ بند کر لیا۔ اپنی غلطی کا احساس اسے ماں کی نمناک آنکھوں سے ہو رہا تھا' وہ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی لیکن اب کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

شبانہ بیگم نے عاصمہ کے منہ سے اپنی بربادی کا قصہ سنا تو دل کے زخم دوبارہ تازہ ہو گئے۔ یادوں کے چراغ جو گُل ہو کر دھواں دینے لگے تھے دوبارہ جل اٹھے۔ سینے میں رِستے ہوئے ناسوروں کو ٹھیس لگی تو آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھے لیکن انہوں نے پلکوں میں تھمے ہوئے آنسوؤں کو روک لیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر وہ آنسو ڈھلک گئے تو عاصمہ کو تکلیف پہنچے گی۔

کچھ دیر تک اداس اداس نگاہوں سے حسرت و یاس کی تصویر بنی عاصمہ کے مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھتی رہیں پھر دل نہ مانا تو پوچھ بیٹھیں۔

"کیا قصرِ شبانہ کا نام بھی تبدیل ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں.........." عاصمہ کے احساسِ ندامت نے نفرت کی شکل اختیار کر لی۔ حقارت بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے آصف نے بتایا تھا کہ اب وہاں قصرِ ناہید کی تختی لگا دی گئی ہے .... لیکن آپ کو ان باتوں پر غور نہیں کرنا چاہئے .... بھول جائیے اس ماضی کو جس نے آپ کی زندگی کو روگ لگایا ہے۔ جب دوسرے ہمیں یکسر فراموش کر چکے ہیں تو پھر ہم کیوں ان کی یاد میں آنسو بہائیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے بیٹی! مرجانے والے کے غم کو بھلایا جا سکتا ہے لیکن جو زندگی میں دور ہو جائیں ان کی یاد نہیں بھلائی جا سکتی۔" شبانہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر بولیں تو عاصمہ کی روح تڑپ اٹھی۔

"امی جان! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں جلدی میں وہ سب کچھ کہہ گئی جو شاید مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔"

"قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے بیٹی! ہونے والی بات ہمیشہ ہو کر رہتی ہے۔"

"ٹھہریئے .... میں آپ کو انگور کا رس نکال کر دیتی ہوں' دل کو تقویت پہنچے گی۔" عاصمہ نے کہا پھر جلدی سے ماں کے سامنے سے ہٹ گئی۔

انگور کا رس نکال کر ماں کو پلایا پھر بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتوں سے ماں کا دل بہلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ شبانہ بیگم کی آنکھیں بدستور بھیگی بھیگی سی ہیں۔ دل کے چھالے جو پھوٹ گئے تھے۔

عاصمہ سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ خود بھی رو پڑی' ماں کے سینے میں سر چھپا کر بلک اٹھی' سسک پڑی۔ وہ اپنی آنکھوں سے وہ تمام آنسو بہا ڈالنا چاہتی تھی جو مرد کی نفرت نے اسے ورثہ میں دیئے تھے۔

مرد ....

جس نے ایک عورت کی وفا کو ٹھکرا دیا تھا ....

ان رشتوں کو توڑ ڈالا تھا جو جنم جنم کے لئے باندھے گئے تھے۔

ماں نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ زندوں کی جدائی کا غم ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ زندہ ناخن گوشت سے علیحدہ ہو جائے تو تکلیف ضرور ہوتی ہے۔

عاصمہ پھُوٹ پھُوٹ کر روتی رہی اور شبانہ بیگم اپنا غم بھول کر اسے سمجھاتی رہیں۔

گھر پہنچ کر وہ رات بھی عاصمہ نے آنکھوں کے نیچے سے گزار دی تھی۔ کسی کروٹ بھی تو چین نہ آیا تھا۔

ماں کی بیماری کا خیال اسے تڑپاتا رہا۔

باپ کی بے مروتی پر وہ سلگ سلگ اٹھی تھی۔

باپ ....

جس نے اپنی اولاد سے نگاہیں پھیر لی تھیں ....

بیوی کو جیتے جی موت کے منہ میں جھونک دیا تھا..........

پریشان پریشان خیالات تمام رات اُسے تڑپاتے رہے..........

☆======☆======☆

عاصمہ سینی ٹوریم سے گھر آئی تو اس کا چہرہ اُداس اُداس سا تھا۔ شبانہ بیگم کی باتوں نے اس کے سکون میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ ایک اضطراب پیدا کر دیا تھا۔

ثاقب اس کے گھر کے عین سامنے والی قطار میں ایک خوبصورت اور عالیشان بنگلے میں رہتا تھا۔ عاصمہ نے اسے اکثر اسکول آتے جاتے دیکھا تھا' لیکن صرف ایک محسن کی حیثیت سے۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ ثاقب کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے جس کے پاس

زندگی کی تمام آسائشیں موجود تھیں۔ رہنے کے لئے خوبصورت اور عالیشان بنگلہ' گھومنے پھرنے کے لئے لمبی سی قیمتی کار اور گھر میں کام کرنے کے لئے نوکر چاکر۔ سب ہی کچھ تو موجود تھا اس کے پاس۔

صورت شکل کے اعتبار سے بھی اسے حسین کہا جا سکتا تھا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ' خوبصورت خدوخال' بلند قامت اور جامہ زیب' لیکن عاصمہ نے اُسے کبھی ان نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا جن میں محبت کے افسانے پنہاں ہوتے ہیں۔ وہ ثاقب کے بارے میں صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ نہر کے محکمے میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور یہ بات بھی اسے آصف کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ آصف اکثر ثاقب کے ہاں آتا جاتا رہا تھا اور ثاقب نے ادھر کچھ عرصے سے آصف کو باقاعدہ پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا' چنانچہ عاصمہ اسے محض ایک محسن کی حیثیت سے جانتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا تھا کہ وہ اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلی اور ثاقب کی جھلملاتی ہوئی کار اس کے قریب سے ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے کی طرح گزر گئی۔ عاصمہ نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ثاقب پر ڈالی پھر اپنی راہ ہو لی۔

لیکن جب سے شبانہ بیگم بیمار پڑی تھیں ثاقب کی ماں کی ہمدردیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عاصمہ اتنی بچی نہیں تھی کہ نسیمہ بیگم کی آمدورفت کا مطلب نہ سمجھ پاتی' اسے معلوم تھا کہ نسیمہ بیگم کیا چاہتی ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی یقین تھا کہ شبانہ بیگم اس رشتہ کو کبھی قبول نہ کریں گی۔

مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند لگنا مشکل تھا..........

زمین اور آسمان کبھی آپس میں نہیں مل سکتے..........

لیکن ....

جب عاصمہ کو ماں کی زبانی تازہ ترین حالات کا علم ہوا تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا کہ وہ ماں سے صاف لفظوں میں انکار کر دے گی کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن ماں کی بیماری کے خیال سے چپ ہو رہی۔

گھر آئی تو آصف اپنی پڑھائی میں مصروف تھا۔ اس نے آصف کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر ڈیوڑھی عبور کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور تھکے تھکے انداز میں بستر پر گر کر سوچنے لگی۔

وہ ماضی کے قصوں کو نئے سرے سے نئے انداز میں جنم نہ لینے دے گی۔

وہ اٹھتے ہوئے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائے گی۔

ان کا رخ پھیر دے گی ....

اس کے عزائم کبھی متزلزل نہیں ہونے پائیں گے۔

وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے گی ....

آہنی چٹانوں کی طرح جو سنگریزے جمع کر کر کے ایک روز پتھر کا روپ دھار لیتے ہیں وہ بھی اپنا دل پتھر کر لے گی تاکہ بیرونی ماحول اس کے دل کے نہاں خانوں پر اثرانداز نہ ہو سکے..........

اسے مردوں سے نفرت تھی .... شدید نفرت..........

عاصمہ نے بے چینی سے کروٹ بدلی تو اس کی سوچوں کے زاویے پھیلنے لگے۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگی جس نے ایک بڑے آدمی کی شریکِ حیات بن کر زندگی کی مسرتوں میں اپنا حصہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی اولادوں کے مستقبل کی تابناکی کے حسین خواب دیکھے تھے اور ایک وفا شعار عورت کی طرح شوہر کے قدموں میں زندگی کے دس قیمتی سال گزار دیئے تھے' لیکن جب حُسن کی رعنائیاں کم ہوئیں اور جوانی نے بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھا تو شوہر کی نگاہیں بدل گئیں۔

ایک شوہر نے ایک خدمت گزار بیوی کی وفا کو ٹھکرا دیا۔

ایک باپ نے اپنے جگر گوشے کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں .... اور

وہ شوہر.......... وہ باپ ایک مرد ہی تھا۔

مرد..........

جس کی ذات اس بھنورے کی طرح ہوتی ہے جو ہمیشہ منڈلاتا رہتا ہے۔

آج ایک پھول پر تو کل کسی اور پھول پر..........

شیخ عارف علی نے بھی ایک بھنورے کی طرح اپنے صحن گلشن کے اس پھول کو مسل کر دور پھینک دیا تھا جس کی مہک دس سال تک ان کے ذہن میں رچی بسی رہی تھی۔ جس کی خوشبو سے قصرِ شبانہ کا گوشہ گوشہ مہکتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس معصوم کلی کو بھی نظرانداز کر دیا جو پھول کی آغوش میں ابھی چٹکنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

زندگی کی فریب کاریوں نے ایک بسے بسائے گھر کو برباد کر دیا۔ عاصمہ معصوم تھی تڑپ اٹھی لیکن شبانہ بیگم نے اُف تک نہ کی۔ شوہر کی خواہشات کے آگے ہمیشہ کی طرح سر نگوں ہو گئیں اور خاموشی سے ان کا راستہ صاف کر دیا اور اپنے لئے زندگی میں ایک نئی راہ کا تعین کر لیا۔

وہ تنہا اپنے سینے پر غموں کے پہاڑ جھیل گئیں' لیکن کبھی عاصمہ اور آصف کو ان کی بربادی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ سہاگ کی تمام نشانیاں بیچ ڈالیں۔ چہرے کی ملاحت اور شگفتگی کو روند ڈالا لیکن ماتھے پر کبھی تنگ دامانی کے احساس کی ایک شکن تک نہ ابھرنے دی لیکن کب تک۔

دل کے زخم جب ناسور بن گئے تو وہ بستر سے لگ گئیں۔ تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئیں اور پھر اولاد ہی کی خاطر.......... وہ سینی ٹوریم میں بھی داخل ہونے پر آمادہ ہو گئیں.......... ایک مرد کی بے مروتی نے شبانہ بیگم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

عاصمہ سوچتی رہی۔ گزرے ہوئے واقعات ایک بھیانک خواب کی طرح اس کے ذہن کے پردوں پر گھومتے رہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں ماضی کی ایک ایک بات تیر نشتر بن کر چبھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے ایک فیصلہ کر لیا .... وہ مرد کی دسترس کبھی قبول نہیں کرے گی..........

دنیا کو بتا دے گی کہ اگر مرد کی بے وفائی کسی عورت کی زندگی برباد کر سکتی ہے تو عورت کی نفرت بھی مرد کو خس و خاشاک کی طرح جلا کر بھسم کرنے کی طاقت رکھتی ہے..........

وہ کسی مرد کو اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت کبھی نہ دے گی۔

وہ مردوں سے نفرت کرے گی..........

شدید نفرت..........

عاصمہ کے خون کی گردش تیز ہوئی تو اس کا چہرہ تپ کر گلنار ہو گیا۔ غزالی آنکھوں میں ہزاروں رنگ تیر گئے اور پھر اس نے اپنی دراز پلکوں پر مچلنے والے شبنمی قطروں کو اپنے آنچل میں جذب کر لیا۔

"یہ کیا حماقت ہے۔" دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھری۔ "تو ایک مرد کے مظالم کو یاد کر کے آنسو بہا رہی ہے .... دیوانی .... ان آنسوؤں کو ضائع مت کر

.... یہ تو وہ مقدس موتی ہیں جن کی قیمت قارون کے خزانے سے بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔"

عاصمہ انہی خیالات میں محو تھی کہ دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر چونک اٹھی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو آصف کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے آصف! کیا تم پڑھ چکے؟"

"نہیں آپی .... ابھی تو مجھے دیر تک پڑھنا ہے۔"

عاصمہ نے محسوس کیا کہ آصف کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہے' تو پیار سے بولی۔

"کچھ کہنے کے لئے آئے تھے' میرے پاس؟"

آصف نے بڑی سادگی سے کہا۔

"آپی! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو دو کپ چائے بنا دیں۔"

عاصمہ کو چھوٹے بھائی کی درخواست پر ہنسی آ گئی' ہنس کر کہا۔

"صرف اتنی سی بات تھی جسے کہتے ہوئے تم ہچکچا رہے تھے .... جاؤ تم پڑھو .... میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

آصف خوشی خوشی جانے کے لئے پلٹا تو عاصمہ کو معاً کچھ خیال آ گیا۔

"آصف! سنو۔"

آصف کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے' اس نے گھوم کر بہن کو دیکھا تو عاصمہ نے پوچھا۔

"تم نے دو کپ چائے بنانے کو کہا ہے نا!"

"ہاں آپی!"

دوسرا کپ کس کے لئے بنوا رہے ہو؟"

"وہ .... سامنے والے انکل آئے ہیں آپی! مجھے پڑھانے کے لئے۔"

"سامنے والے انکل ...." عاصمہ نے کہا۔ "کیا نام ہے؟"

"وہی آپی! ثاقب انکل۔"

"ثاقب ...." عاصمہ یہ نام سن کر یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ اس کے اندر کی عورت چونک کر بیدار ہو گئی۔ نفرت کا جذبہ ابھر کر اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ اس نے سوچا ثاقب اس کے ہاں کیوں آیا ہے۔

آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

آصف اپنی پڑھائی کے سلسلے میں ہمیشہ اس کے ہاں چلا جاتا تھا' خود ثاقب ہی نے ایک بار اسے کہا تھا کہ اگر کوئی چیز سمجھ میں نہ آیا کرے تو وہ بلا تکلف اس سے پوچھ لیا کرے۔ آصف نے اس خواہش کا اظہار عاصمہ کے سامنے جب پہلی بار کیا تو عاصمہ نے اسے ثاقب سے پڑھنے کے لئے منع نہیں کیا۔

لیکن آج ....

آج وہ بڑی سنجیدگی سے ثاقب کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ آج پہلی بار ثاقب نے اس کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔

مگر کیوں .... کس لئے؟

کیا وہ آصف کے ذریعہ عاصمہ کی زندگی میں داخل ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا .... یا .... پھر آصف کو پڑھانے کے احسان کا بدلہ چاہتا تھا............!

عاصمہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ آصف کی آواز دوبارہ اس کے کانوں میں ٹکرائی۔

"میں اب جاؤں آپی!"

عاصمہ کے خیالات کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر آصف کو دیکھا پھر دل میں کچھ سوچ کر بولی۔

"جاؤ .... میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

آصف کے جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں ایک اہم فیصلہ کر کے اٹھی۔ باورچی خانے میں جا کر چائے تیار کی۔ پھر اسے ٹرے میں رکھ کر بیٹھک میں آ گئی۔ جہاں آصف بیٹھا ثاقب سے پڑھ رہا تھا۔

عاصمہ نے غور سے ثاقب کو دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا آصف کو کوئی سوال سمجھا رہا تھا' اس کے چہرے پر کس قدر معصومیت تھی۔ کتنی سادگی تھی اس کی باتوں میں' بولنے کا انداز نہایت مہذب اور شستہ تھا۔ گرے رنگ کی پتلون اور سفید ٹی شرٹ میں وہ اس وقت بہت جچ رہا تھا۔ بالوں کی ایک آوارہ لٹ اس کی پیشانی پر لہراتی ہوئی کس قدر حسین لگ رہی تھی۔

عاصمہ ایک لمحہ کے لئے ثاقب کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے اپنے ذہن کو جھٹک کر صاف کیا اور آگے بڑھ کر چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔

ثاقب نے عاصمہ کو دیکھا تو ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید عاصمہ کے حُسن کا رعب تھا جو اس سے یہ حرکت سرزد ہو گئی یا پھر وہ محض اس کا احترام کرنے کی خاطر اٹھا تھا۔

آصف نے ٹرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی طرف دیکھا تو بہن سے پوچھا۔

"آپی! کیا آپ چائے نہیں پئیں گی؟"

"نہیں .... مجھے اس وقت خواہش نہیں ہو رہی ہے۔" عاصمہ نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر وہ وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی کہ ثاقب نے کہا۔

"آصف میاں نے آپ کو خواہ مخواہ کی زحمت دی' ورنہ میں بھی اس وقت چائے پینے کا عادی نہیں ہوں۔"

عاصمہ نے گھور کر ثاقب کو دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔

"میرے گھر پر کچھ مہمان آ گئے تھے اس لئے آج میں آصف کو پڑھانے کی خاطر یہیں آ گیا۔" ثاقب نے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ "کل سے یہ پھر میرے یہاں آ کر پڑھا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے.........." عاصمہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کی والدہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" ثاقب کی نرم آواز میں خلوص چھلک رہا تھا مگر عاصمہ اُسے مخاطب کرنے کا بہانہ سمجھ کر تلملا اٹھی۔ بڑی سرد مہری سے بولی۔

"کل آپ کی والدہ بھی تو گئی تھیں امی جان کے پاس۔ کیا انہوں نے آپ کو نہیں بتایا؟"

ثاقب سٹپٹا کر رہ گیا' عاصمہ کے طرزِ تخاطب نے اسے افسردہ کر دیا تو عاصمہ دل ہی دل میں اپنی فتح پر مسکرا دی۔

"امی جان نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ آپ کی والدہ کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔" ثاقب نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"جی ہاں' آپ کی والدہ نے درست کہا ہے۔" عاصمہ بولی۔ اس کے لہجے میں اس بار بھی تیکھا پن شامل تھا۔

"میرا خیال ہے کہ شاید آپ کو میرے سوال سے تکلیف پہنچی ہے۔" ثاقب نے دبی زبان میں کہا۔

"چائے پی لیجئے' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" عاصمہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ پھر ایک شانِ بے نیازی سے پلٹی اور قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے جملوں نے ثاقب کے اوپر کیا اثر چھوڑا تھا۔ ضرورت بھی نہیں محسوس کی تھی اس نے۔ وہ تو بس ثاقب پر اپنی نفرت کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ اپنی بے رُخی کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگی۔

☆======☆======☆

شیخ عارف علی نئی شادی کے ہنگاموں میں کچھ ایسے اُلجھے کہ انہیں اتنی فرصت بھی نہ رہی کہ شبانہ بیگم یا بچوں کی خبر لیتے۔ ناہید کی سحرکاریوں نے انہیں اپنے دام میں کچھ ایسا الجھایا کہ وہ سب کچھ بھول بیٹھے۔ بڑھاپا جوانی کی بندشوں میں جکڑ کر رہ گیا۔

عارف علی کو اپنی شہرت اور دولت پر بڑا ناز تھا۔ اسی دولت ہی کے بل بوتے پر وہ ناہید کو بیاہ کر لائے تھے ورنہ ان کی اور ناہید کی عمروں میں زمین آسمان کا تضاد تھا۔ عارف علی کی عمر چالیس سال تھی اور ناہید نے اٹھارہویں بہار میں قدم رکھا تھا' جب اس کی ملاقات عارف علی سے ہوئی۔

ناہید درمیانہ طبقے کی چشم و چراغ تھی لیکن حُسن اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ دو چار ملاقاتوں میں اس نے عارف علی کو اپنی زلف گرہ گیر میں ایسا اُلجھایا کہ وہ ماہئ بے آب کی طرح تڑپ اٹھے۔ عشوہ طرازیوں کے سنہری جال میں الجھتے چلے گئے اور پھر ایک دن انہوں نے شبانہ بیگم کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ ناہید سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

شبانہ بیگم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ گھر کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ بچوں کے مستقبل کا واسطہ دیا لیکن سب بے سود رہا۔ عارف علی اپنی ضد پر ڈٹے رہے چنانچہ شبانہ بیگم کی وفاؤں کو ٹھکرا دیا۔ عاصمہ کی معصوم معصوم باتوں کو فراموش کرنے کی ٹھان لی اور آخر کار ناہید کو بیاہ کر ہی دم لیا۔

ناہید نے قصرِ شبانہ کی شان و شوکت کو دیکھا تو اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ نوکر چاکر مال و دولت اور جھلملاتی ہوئی کاریں' سبھی کچھ تو میسر تھا۔ وہ اپنی قسمت پہ نازاں تھی۔ اس لئے نہیں کہ اس نے عارف علی کو جیت لیا تھا بلکہ اس لئے کہ اس نے اپنی غربت

کے ساتھ جو سلسلہ [illegible] تھا اس میں اسے توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی تھی۔

قصرِ شبانہ میں قدم رکھتے ہی اس نے حکمت عملی سے نہ صرف عارف علی کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا بلکہ رفتہ رفتہ ہر چیز پر اپنا تسلط جما لیا۔

عارف علی، ناہید جیسی کمسن اور حسین بیوی پا کر دوبارہ جوان ہونے کی تمنا کر رہے تھے۔ ناہید کی ناز برداریوں میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ اس کی آنکھوں کی ایک ایک جنبش پر ہزار جان سے قربان ہو ہو جاتے۔ کیا مجال تھی کہ ناہید کسی چیز کی فرمائش کرتی اور اس کی تکمیل میں ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی۔

دن یوں ہی ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ پھر مہینے سال میں بدلنے لگے لیکن عارف علی کی حُسن پرستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ نئی نویلی دلہن کے اشاروں پر کسی سدھائے ہوئے بندر کی طرح ناچتے رہے اور ناہید انہیں اپنی انگلیوں پر نچاتی رہی۔

انہی ہنگاموں میں اُلجھ کر عارف علی شبانہ بیگم کی وفاؤں، عاصمہ کی معصوم معصوم باتوں کو یکسر بھول گئے۔ انہیں یہ بھی تو نہ یاد رہا کہ شبانہ بیگم نے جب گھر کی دہلیز سے باہر قدم نکالا تھا تو اس وقت وہ ایک اور بچے کی ماں بننے والی تھیں۔ انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ ان باتوں پر غور کرتے۔ ناہید کے حُسن کی سحر کاریوں نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور یہ پٹی اس روز کھلی جب ناہید نے ایک دن عارف علی کی موجودگی میں گھر کے ایک ملازم کو بلا کر حکم دیا تھا کہ قصرِ شبانہ کی پرانی تختی نکال پھینکی جائے اور اس کی جگہ قصرِ ناہید کی تختی آویزاں کی جائے۔

اس روز ایک عرصے کے بعد عارف علی کو پہلی بار اپنے دل میں کسی چبھن کا احساس ہوا تھا۔ شبانہ بیگم کے ساتھ گزارے ہوئے حسین لمحات ان کے ذہن کے پردوں پر ابھر آئے، اور پھر ننھی عاصمہ کی قلقاریاں ان کے کانوں میں گونج اٹھیں۔ شبانہ بیگم کے وجود میں پرورش پاتی ہوئی اس زندگی کا خیال بھی آیا جس کو انہوں نے آج تک ایک نظر دیکھا تک نہ تھا۔ انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا............! زندہ بھی ہے یا موت سے ہم آغوش ہو گئی............

عارف علی ایک لمحے کے لئے ماضی کے تانے بانے میں اُلجھ کر رہ گئے۔ انہیں اپنے کئے پر شرمندگی ضرور تھی، لیکن ناہید کے ساتھ گزاری ہوئی گرم گرم راتوں نے ماضی کے خوابوں کو جھلسا ڈالا تھا۔ کچھ دبی دبی چنگاریاں تھیں جو آج ناہید کے ہوا دینے سے دبی دبی

راکھ کے ڈھیر سے باہر نکل آئی تھیں۔ شاید اس لئے کہ قصرِ شبانہ کی تختی کے نقش بھی اب مٹنے والے تھے۔

ناہید نے ان سے مشورہ کئے بغیر ہی ملازم کو حکم دے دیا تو وہ چپ ہو گئے۔ ملازم کی موجودگی میں ناہید سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا تو ذہن کی کچھ گرہیں کھل گئیں۔ انہیں جہاں اپنی حرکت پر شرمندگی کا احساس ہوا وہاں مرد کی فطرت بھی شامل حال تھی۔

وہ اس وقت بھی یہی سوچ رہے تھے کہ جو کچھ ہوا اس میں شبانہ بیگم کی غلطی کو زیادہ دخل ہے، ورنہ انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ اور عاصمہ گھر کے ایک الگ تھلگ حصے کو اپنے لئے مخصوص کر سکتی ہیں۔ وہ شبانہ بیگم اور عاصمہ کے اخراجات اٹھانے پر بھی آمادہ تھے لیکن شبانہ بیگم کچھ کہے بغیر ہی ان کی زندگی سے الگ ہو گئیں............

عارف علی اس خیال پر جھلا گئے۔ وہ مرد تھے اس لئے ایک عورت کے جذبات کو نہ سمجھ سکے۔ ایک ماں کی ممتا کی تڑپ نہ محسوس کر سکے۔

عورت............

جو وفا کی پتلی ہوتی ہے............

جو شوہر کے ہر اشارے پر اپنی جان تک قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتی............

لیکن اپنی وفا کی تذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی............

اپنے سہاگ پر کسی اور کا تسلط نہیں برداشت کر سکتی............

اور پھر شبانہ بیگم تو ایک معصوم بچی کی ماں بھی تھیں............

ماں............

جس کی ممتا کے مقدس جذبات کے آگے دنیا کے تمام جذبے ہیچ ہیں............

جو اولاد کی خاطر اپنا حُسن، اپنی جوانی سب کچھ تاراج کر دیتی ہے............

خود کو مٹا دیتی ہے............

فنا کر دیتی ہے، لیکن اولاد کے مستقبل کو تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتی............

مگر عارف علی عورت کے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے سے قاصر تھے۔ وہ باپ تھے اس لئے ایک ماں کی ممتا کو نہ سمجھ سکے اور شبانہ بیگم کو موردِ الزام سمجھ بیٹھے۔

لیکن آج جب ناہید نے شبانہ کے نام کی تختی کو ہٹانے کا حکم دیا تو نہ جانے کیوں ان کو تکلیف ہوئی تھی۔ شاید اس لئے کہ کبھی ناہید ہی کی طرح وہ شبانہ بیگم کو بھی بڑے

ارمانوں سے بیاہ کر لائے تھے۔

زندگی کا کچھ حصہ انہوں نے شبانہ بیگم کے ساتھ بھی ہنس کر گزارا تھا۔

وقت کی آندھی نے خونی رشتوں کے درمیان ایک خوبصورت دیوار ضرور حائل کر دی تھی لیکن رشتے ابھی ٹوٹے نہیں تھے' باقی تھے۔ شبانہ بیگم کا نقش ابھی ان کے دل سے یکسر نہیں مٹا تھا۔ کچھ دھندلے دھندلے سے نشان اب بھی موجود تھے اور عارف علی شبانہ بیگم کی خاطر نہ سہی اولاد کی خاطر ان دھندلائے ہوئے نشانوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

ملازم سر جھکا کر جب ناہید کے سامنے سے چلا گیا تو انہوں نے ڈرتے ڈرتے دبی زبان میں کہا تھا۔

"میرے خیال میں تم نے شبانہ کے نام کی تختی کے سلسلے میں غلط فیصلہ کیا ہے۔"

ناہید نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں' کیا آپ کو یہ بات ناگوار گزری ہے؟"

عارف علی پہلو بدل کر بولے۔

"اگر اس تختی کو رہنے دیا جائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔"

ناہید کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں' اس نے عارف علی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا شبانہ بیگم کی یاد ابھی تک آپ کے دل میں باقی ہے؟"

عارف علی نے جلدی سے کہا۔

"غلط مت سمجھو میری زندگی.......... میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ پاس پڑوس والوں کو خواہ مخواہ کی ایک بات مل جائے گی۔"

ناہید نے شوہر کو نرم پڑتے دیکھا تو اور بپھر کر بولی۔

"اگر آپ کو مجھ سے زیادہ پڑوسیوں کا خیال ہے تو پھر جا کر لے آیئے نا شبانہ کو' مجھے کب اعتراض ہے۔"

عارف علی نے کہا۔

"تم تو خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہو۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں شبانہ کو واپس لانا چاہتا ہوں.........."

"پھر.......... اس کے نام سے آپ کو اتنا لگاؤ کس لئے ہے؟" ناہید نے پوچھا۔

عارف علی سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو زبردستی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے۔

"کیوں ایک بات کو پکڑ کر بیٹھ گئی ہو.......... تم شبانہ کے نام کی تختی ہٹوانا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے ہٹوا دو.......... میں کل ہی معمار سے کہہ دوں گا کہ وہ سنگِ مرمر پر قصرِ ناہید کندہ کر کے لے آئے.......... اب تو خوش ہو نا!"

ناہید نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا تو ایک ادائے دلنوازی سے کہا۔

"آپ سچ مچ بہت گریٹ ہیں۔"

"تم بھی کم نہیں ہو۔"

"کیوں بنا رہے ہیں مجھے؟" ناہید اٹھلا کر بولی۔ "کہاں میں اور کہاں آپ۔"

اور دوسرے ہی دن شبانہ کے نام کی تختی کی جگہ قصرِ ناہید کا خوبصورت پتھر جڑ دیا گیا۔ عارف علی کو وقتی طور پر اس تبدیلی سے جو رنج ہوا تھا وہ دائمی ثابت نہ ہو سکا۔ ناہید کے گداز جسم کی گرمی اور حسن کی نوازشوں نے عارف علی کے احساس کو پگھلا کر دو ہی دن میں رکھ دیا اور وہ ایک بار پھر ناہید کے سحر میں پھنس کر سب کچھ بھول گئے۔

وقت کا پنچھی تیزی سے اڑتا رہا اور اپنے پیچھے زندگی کے بارہ طویل سال چھوڑ گیا۔ عارف علی ناہید کی گداز بانہوں میں الجھ کر اپنے فرائض کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔ شبانہ بیگم اور عاصمہ کی یاد ان کے لاشعور کی گہرائیوں میں دب کر رہ گئی لیکن پھر وقت نے ایک کروٹ بدلی اور عارف علی خوابِ غفلت سے چونک کر بیدار ہو گئے۔

انہیں اس بات کا صدمہ تھا کہ ناہید کی گود ابھی تک ہری نہیں ہوئی تھی۔ بارہا انہوں نے ناہید کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کرے' لیکن ناہید ہر بار انہیں مسکرا کر ٹال دیا کرتی' لیکن قسمت کو شاید ناہید کی حیلہ سازیاں پسند نہ آئیں اور ایک ایسا موقع آ ہی گیا جب عارف علی کو اس بات کا علم ہو گیا کہ ناہید کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنے سے کیوں گریزاں تھی۔

ان دنوں وہ سخت بخار میں مبتلا تھی۔ عارف علی ہمہ وقت اس کی تیمارداری میں مصروف رہتے۔ شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹر ناہید کا علاج کر رہے تھے۔ ان میں ڈاکٹر فاروقی بھی تھے جن سے عارف علی کی پرانی شناسائی تھی۔

ایک روز جب ڈاکٹر فاروقی ناہید کو انجکشن لگا کر جانے لگے تو عارف علی نے جھجکتے

جھجکتے کہا۔

"ڈاکٹر! کیا ناہید مجھے بڑھاپے کا سہارا دینے میں ہمیشہ مایوس کرتی رہے گی؟"

ڈاکٹر فاروقی نے پلٹ کر عارف علی کے چہرے پر برسنے والی مایوسی دیکھی' پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"آپ نے شبانہ بیگم کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر کے اچھا نہیں کیا۔"

عارف علی ناہید کی بیماری کی طرف سے فکرمند تھے۔ شبانہ کا نام درمیان میں آ گیا تو جھلا کر بولے۔

"جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ڈاکٹر! میں اب ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔"

فاروقی نے سنجیدگی سے کہا۔

"ناہید آپ کی خواہشات کا احترام کبھی نہ کر سکے گی۔"

عارف علی نے چونک کر ڈاکٹر فاروقی کو دیکھا تو فاروقی نے واضح طور پر یہ راز منکشف کر دیا کہ ناہید تمام زندگی کسی بچے کی ماں نہیں بن سکتی۔

"کیوں.........!" عارف نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ ناہید کو غالباً بچوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں ڈاکٹر!"

"ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو' لیکن جہاں تک میرے تجربوں کو دخل ہے میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ ناہید نے شادی سے قبل ہی آپریشن کے ذریعہ افزائش نسل کے امکانات ختم کرا لئے تھے .... آپ مناسب سمجھیں تو کسی لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھا لیں۔"

عارف علی نے ڈاکٹر کی بات سنی تو ان کا سر چکرا کر رہ گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا پھیل گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ناہید ان کے ساتھ اتنا بڑا فریب کرے گی۔

آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹے تو عارف علی کو اس بات کا احساس بھی بڑی شدت سے ہوا کہ ناہید اس قدر ماڈرن کیوں تھی .... کلبوں' ہوٹلوں تفریح گاہوں میں سیر سپاٹے کیوں ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں میں اس قدر گھلی ملی کیوں رہتی تھی .... شاید اسی لئے کہ اسے کوئی خدشہ نہیں تھا......... کوئی خوف نہیں تھا.........!

لیکن پانی اب سر سے گزر چکا تھا۔ عارف علی نے بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ ناہید پر آئندہ سے کڑی نگرانی رکھیں گے' اسے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے پر پابندی لگا دیں گے۔ غلط راہ روی کی روک تھام کریں گے۔

ناہید جب صحت یاب ہو کر بستر سے اٹھی تو اس کے مشاغل پھر جاری ہو گئے۔ عارف علی کچھ روز تک صبر کئے رہے' لیکن ایک دن ناہید جب رات کو دیر سے گھر واپس ہوئی تو عارف علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا۔ انہوں نے دبی زبان میں ناہید سے کہا کہ انہیں اس کی یہ آزادی بالکل پسند نہیں ہے۔

ناہید ایک آزاد پنچھی تھی۔ اس نے ہمیشہ اونچی پرواز کے خواب دیکھے تھے اور پھر انہی خوابوں کی تکمیل کی خاطر تو اس نے عارف علی کو اپنے خوبصورت جال میں پھانسا تھا۔ ورنہ وہ اپنی جوانی کو بڑھاپے سے ہمکنار کرنے کا کبھی تصور بھی نہ کرتی۔

عارف علی نے ہرچند کہ دبی زبان میں اسے اپنا عندیہ سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ وہ اپنی تذلیل برداشت نہ کر سکی۔ کھلی ہواؤں میں رہنے والا پرندہ بھلا سلاخوں کی قید و بند کیسے برداشت کر لیتا۔

حُسن' عشق کے سامنے جھک جانے کے لئے آمادہ نہ ہو سکا' جوانی بڑھاپے کے آگے ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔

ناہید نے خشمگیں نظروں سے عارف علی کو دیکھا پھر سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ کو میرے کردار پر کسی قسم کا شبہ ہے۔"

عارف علی نے تیزی سے کہا۔

"شبہ نہ سہی لیکن مجھے تمہاری یہ آزادی بھی پسند نہیں ہے۔"

"پہلے آپ کو اس بات کا خیال کبھی نہیں آیا؟" ناہید نے طنز کیا۔

عارف علی سٹپٹا کر بولے۔

"میں اب بھی تم کو گھومنے پھرنے سے منع نہیں کرتا' لیکن تفریح کی غرض سے تم میرے ساتھ چلا کرو۔"

"میرے تنہا آنے جانے میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟" ناہید نے بھنویں سکیڑ کر قدرے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"میں اب اسے پسند نہیں کرتا۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔" عارف علی تلملا کر بولے۔

ناہید کو غصے کے باوجود ہنسی آ گئی۔ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "بڑی جلدی خیال آ گیا آپ کو اس بات کا۔"

عارف علی کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ ناہید کے قہقہے نے ان کی غیرت اور ان کی حمیت کو للکارا تھا۔ قدرے جھلا کر کہا۔

"بات بڑھانے کی کوشش مت کرو' تمہیں میرے حکم کو مان لینا چاہئے۔"

ناہید اس برتاؤ کی عادی نہیں تھی۔ تڑپ کر بولی۔

"لوگ میرے تنہا گھومنے پھرنے پر آپ کا مذاق اڑاتے ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"لیکن اگر آپ میرے ساتھ ہوئے تو وہی لوگ میرا بھی مذاق اڑا سکتے ہیں۔" ناہید نے تلخ لہجے میں کہا۔

عارف علی نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔

"گویا تمہیں میرا حکم ماننے سے انکار ہے۔"

ناہید لاپرواہی سے شانے اُچکا کر بولی۔

"قطعاً نہیں .... لیکن میں اپنی آزادی کو بھی سلب نہیں کر سکتی۔"

"تم میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔" عارف علی نے غصے سے کہا۔

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو۔" ناہید یہ کہہ کر اپنی خواب گاہ کی طرف جانے کے لیے بڑھی تو عارف علی چیخ اٹھے۔

"ناہید!"

ناہید چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح پلٹی' گرج کر پوچھا۔

"فرمائیے .... اب کیا کہنا ہے؟"

"تمہیں میرا ہر حکم ماننا پڑے گا۔"

"آپ بھول رہے ہیں' میں شبانہ نہیں بلکہ ناہید ہوں۔"

"تمہیں اپنے رویہ پر پچھتانا پڑے گا۔"

"ناممکن.........." ناہید زہرخند سے بولی۔ "میں اس وقت بھی نہیں پچھتائی تھی جب میں نے آپ سے شادی کی ہامی بھری تھی۔"

"تم نے مجھے فریب دیا تھا۔" عارف علی غصے میں لال پیلے ہو کر بولے۔

"فریب .... ہونہہ۔" ناہید نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ "فریب کا لفظ آپ کی زبان سے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے کہ آپ نے بھی شبانہ کے ساتھ فریب ہی کیا تھا .... اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا .... آج اگر میں نے آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔" عارف علی کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔

"بڑے شوق سے دے دیجئے۔" ناہید نے تیزی سے کہا۔ "میں شبانہ نہیں ہوں جو آپ کے نام پر گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گی۔ اس لئے کہ مجھے آپ کی نہیں بلکہ دولت کی ضرورت ہے اور اسی ضرورت کے تحت میں نے آپ سے شادی بھی کی تھی۔"

عارف علی کا سر گھوم کر رہ گیا۔ ناہید کی گفتگو نے آج ان کی شہرت اور ان کی دولت کے منہ پر ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا تھا کہ ان کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔

انہوں نے ناہید سے آج بہت کچھ کہنے کا ارادہ کیا تھا۔ ہزاروں منصوبے باندھے تھے لیکن ناہید کے ایک ہی جواب نے جیسے انہیں گنگ کر دیا ہو۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کھڑے ناہید کو دیکھتے رہے

جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو..........

جیسے انہیں اپنی قوت سماعت پر دھوکہ ہو رہا تھا۔

جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے تھے ....

بھیانک خواب ....

جس کی تعبیر ناہید کی صورت میں اس وقت ان کے سامنے موجود تھی۔

ناہید اپنی جگہ آہنی چٹان کی طرح اٹل رہی۔ اس کی غصے میں وا نگاہیں عارف علی کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کے قدم لڑکھڑانے نہیں پائے۔ وہ اپنی جگہ ثابت قدم رہی۔ اس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر کس قدر قلبی سکون محسوس کیا تھا۔

جیسے آج اس کے دل سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

بوجھ ....

جسے آج تک وہ مجبوراً برداشت کر رہی تھی ....

محض اپنے خوابوں کی تکمیل کی خاطر............

آج اس نے وہ بوجھ اپنے ذہن سے اتار پھینکا تھا اور اب خود کو کس قدر ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

اور قدرت' عارف علی کی بے کسی اور بے بسی پر قہقہہ زن تھی۔

عورت' عورت کا فرق سمجھا رہی تھی ....

ایک عورت شبانہ تھی جس نے شوہر کی عظمت کو سینے سے لگا کر دولت کو ٹھکرا دیا تھا .... اور

ایک ناہید تھی جو دولت کی خاطر شوہر کی محبت کو ٹھکرا دینے پر آمادہ تھی۔

کتنا تضاد تھا شبانہ اور ناہید میں ....

ایک شعلہ تھی تو ایک شبنم ....

عارف علی تصویرِ حیرت بنے اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے ناہید کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورتے رہے تو ناہید نے مہرِ سکوت توڑ کر نخوتِ حُسن سے کہا۔

"مجھے اب نیند آ رہی ہے' کچھ اور بھی کہنا ہے آپ کو............"

جواب میں عارف علی کی طرف سے خاموشی ہی ملی۔

"او کے............" ناہید ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔ آرام کروں گی .... آپ رات بھر میں کوئی فیصلہ کر کے صبح مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔"

ناہید مسکراتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی تو عارف علی کی آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا طلسم ٹوٹ کر تار تار ہو گیا۔ دل کے ارمان دل میں ہی گھٹ گھٹ کر رہ گئے' سارے حوصلے حُسن کے سامنے ماند پڑ گئے تھے۔

تھوڑی دیر تک اپنی جگہ کھڑے غصے میں پیچ و تاب کھاتے رہے' پھر تھکے تھکے انداز میں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے اور بستر پر گر کر یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے ہارا ہوا جواری دنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی خاطر آنکھیں موند کر سب

کچھ بھول جانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس رات انہیں کسی کروٹ بھی چین نہیں آیا تھا۔

☆======☆======☆

عاصمہ نے حسبِ معمول صبح اٹھ کر وضو کر کے نماز پڑھی' جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا' آصف کو اسکول روانہ کیا پھر خود بھی کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج اس کا دل صبح ہی سے نہ جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔ کسی انجانے احساس نے اسے بے چین کر دیا تھا لیکن کوشش پیہم کے باوجود وہ دل کی اس کیفیت کا سبب نہ جان سکی۔

کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلی تو ایک بار پھر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی' دل کی حالت پر غور کرنے لگی جو آج بار بار بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہوا جا رہا تھا۔

کیا وجہ ہے............؟

کیا ہونے والا ہے............؟

عاصمہ نے سوچا اور پھر یکلخت اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

اسے اچانک شبانہ بیگم کا خیال آ گیا جو ایک دو روز میں روبصحت ہو کر گھر آنے والی تھیں لیکن............

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کی حالت اچانک کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہو۔

وہ گھر آنے سے پیشتر ہی............

"نہیں .... نہیں............" عاصمہ خود اپنے ہی تصور سے خائف ہو کر چیخ پڑی۔

"میرے معبود! رحم' دنیا میں ماں کے علاوہ اب میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ اسے اتنی جلدی مجھ سے نہ چھین لینا۔"

عاصمہ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ماں کی بیماری کے تصور نے اسے لرزا دیا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ اسکول کا ناغہ کر کے سیدھی سینی ٹوریم چلی جائے۔

نہ جانے کیوں آج وہ رہ رہ کر بے چین ہو رہی تھی............

دل تھا کہ بار بار دھڑک اٹھتا تھا............

آخر کیوں............؟

کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

عاصمہ کا ذہن بکھرے بکھرے پریشان خیالات کی وجہ سے الجھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ گم صم کھڑی فیصلہ کرتی رہی۔ پھر دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز سن کر وہ یوں چونکی تھی جیسے وہ ضرب دروازے پر نہیں بلکہ براہِ راست اس کے دل پر لگی ہو۔

اس کا دل پھر دھڑک اٹھا۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے۔" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا۔ ایک صرف آصف ہی تھا جو دیر ہوئی اسکول جا چکا تھا اور کون تھا جو اس وقت وہاں آتا۔

عاصمہ بے چین ہو کر رہ گئی۔ ہزاروں وسوسے اس کے معصوم دل پر چرکے لگا رہے تھے' کوئی غیر مرئی قوت تھی جس نے اس کے قدم جکڑ رکھے تھے اور ذہن میں ایک تلاطم سا برپا تھا۔

تلاطم .... جس کے بارے میں وہ کوئی آخری فیصلہ نہیں کر پائی تھی اور پھر اچانک اس نے سوچا۔ "کہیں ثاقب تو نہیں ہیں۔"

لیکن ثاقب کو اس وقت اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ وہ تو صبح سویرے ہی دفتر چلے جاتے ہیں۔

اور پھر ایک دوسرا خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔

کہیں سینی ٹوریم سے کوئی اندوہناک اطلاع تو نہیں آئی ہے۔

عاصمہ کا پورا وجود بیدِ مجنوں کی طرح لرز اٹھا۔ دل کی گہرائی سے خون کے کچھ قطرے اُبلے' پلکوں تک آئے پھر آنسو بن کر اس کے حسین رُخساروں سے ڈھلک کر زمین کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرے لپکنے لگے۔ اس کا سر چکرا کر رہ گیا اور پھر قریب تھا کہ وہ گر جاتی۔ دروازے پر دوبارہ دستک کی آواز ابھری اور عاصمہ نے خود کو سنبھال لیا۔

آنسو خشک کرتی' دل کی کیفیت کو سنبھالتی' کانپتے لرزتے قدموں سے دروازے تک آئی۔ پھر ڈوبتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

باہر سے ایک مضمحل سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو بیٹی .... مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

عاصمہ کو یوں محسوس ہوا جیسے بولنے والے کا لہجہ اس کے لئے مانوس سا ہے۔ وہ اس آواز کو پہلے بھی متعدد بار سن چکی تھی .... کہاں؟ .... یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر آگے بڑھ کر کنڈی کھول دی۔ دروازے کے پٹ کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

ذہن کے سارے وسوسے مٹ کر رہ گئے۔ لاشعور کی تمام گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ خون نے خون کو پہچان لیا۔ دروازے پر کھڑی ہوئی شخصیت شیخ عارف علی کے سوا کسی اور کی نہ تھی۔

شیخ عارف علی...........

جو عاصمہ کے باپ تھے لیکن انہوں نے اپنی تمناؤں کی تکمیل کی خاطر عاصمہ کی معصوم آرزوؤں کو پامال کر دیا تھا۔

شیخ عارف علی...........

جو شبانہ بیگم کے شوہر تھے۔ مگر ناہید کی خاطر انہوں نے اپنی شریکِ حیات کی وفا کو ٹھکرا دیا تھا۔

شیخ عارف علی...........

جو آصف کے باپ تھے لیکن باپ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے جگر گوشے کی خبر نہ لی تھی۔

عاصمہ کے ذہن میں ماضی کے افسانے ابھرے تو نفرت کا جذبہ بھی سوئے ہوئے طوفان کی طرح یکلخت بیدار ہو گیا۔ وہ تصویرِ حیرت بنی اس باپ کو دیکھ رہی تھی جو بارہ سال بعد آج نہ جانے کیسے راستہ بھول کر اس کی دہلیز تک آ گیا تھا۔

دوسری طرف عارف علی عاصمہ کو یوں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ شاید ناہید کی جھوٹی محبت اور مکر و فریب کے رنگین پردے ابھی تک پوری طرح ان کی نظروں سے دور نہیں ہوئے تھے۔ دل کی دھڑکنیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وہ ان کی اپنی عاصمہ ہے لیکن شرمندگی کے احساس کے شبہات نے جیسے انہیں گنگ کر ڈالا تھا۔

کس قدر روح فرسا تھا یہ منظر...........

باپ بیٹی آمنے سامنے کھڑے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
بارہ سال کی مدت کے بعد آپس میں آمنا سامنا ہوا تھا.........
لیکن ....
باپ کی زبان احساس ندامت سے بند تھی .... اور
بیٹی کے دل میں باپ کی طرف سے نفرت کا طوفان بھرا ہوا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے ....
آتش فشاں کی طرح ....
جو پھٹ پڑنے کے لئے بے چین تھا.........
کتنے لمحات یوں ہی گزر گئے اور پھر عارف علی نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔
"بیٹی! کیا یہ شبانہ بیگم کا مکان ہے؟"

عاصمہ تڑپ اٹھی۔ اس کا دل چاہا کہ باپ کے سامنے سے ہٹ جائے' گھر کے دروازے ان پر بند کر دے لیکن نفرت کے جذبے نے اسے ایک باپ کے سامنے' ایک مرد کے سامنے ڈٹا رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے عارف علی کو غیرت بھری نگاہوں سے دیکھا پھر بولی۔

"آپ کس شبانہ بیگم کی بات کر رہے ہیں محترم!"

عارف علی نے حیرت سے چونک کر عاصمہ کو دیکھا۔ ایک ثانئے کے لئے ان کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ ممکن ہے کہ وہ غلط جگہ پر آ گئے ہوں' لیکن یہ احساس زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ انہوں نے بڑی مشکلوں سے اپنی کھوئی ہوئی منزل کا سراغ پایا تھا اور پھر انہوں نے عاصمہ کو پہچان بھی تو لیا تھا۔

باپ کی آغوش اپنی اس اولاد کو بھلا کیسے بھول سکتی تھی جسے پہروں گود میں لے کر کھلا چکی تھی۔ وہ بازو ابھی زندہ تھے جنہوں نے عاصمہ کو تھپک تھپک کر سلایا تھا اس کی پرورش کی تھی' لیکن عاصمہ کے جواب نے جیسے عارف علی کے دل پر ایک کاری ضرب لگائی تھی۔ نظریں جھکا کر وہ کچھ سوچتے رہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"بیٹی! کیا تمہارا نام عاصمہ عارف نہیں ہے؟"

عاصمہ کے دل میں باپ کی سوئی ہوئی محبت جاگنے کے لئے کسمسائی تو اس نے اس محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ تلخ آواز میں کہا۔

"آپ ابھی شبانہ بیگم کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔"
عارف علی نے عاصمہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں .... کیا وہ گھر پر موجود ہیں؟"
"نہیں۔" عاصمہ نے رُکھائی سے جواب دیا۔
"پھر کہاں ہیں وہ؟" عارف نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہ .... وہ شبانہ بیگم مر چکی ہیں جنہیں آپ دریافت فرما رہے ہیں۔" عاصمہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے تلخی سے جواب دیا۔

"مر چکی ہیں.........!" عارف علی نے حیرت سے عاصمہ کے الفاظ دہرائے' پھر بے چینی سے بولے۔ "کیا تم شبانہ کی بیٹی نہیں ہو؟"

عاصمہ نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔
"مجھے فخر ہے کہ میں شبانہ بیگم کی اولاد ہوں۔"
عارف علی کی محبت میں ابال آنے لگا۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"عاصمہ .... میری بچی .... میری خون جگر .... تم نے اپنے اس گناہگار باپ کو بھی نہیں پہچانا؟"

جواب میں عاصمہ نے باپ کو حقارت سے گھورا منہ سے کچھ نہ بولی۔
"میں تمہارا باپ ہوں عاصمہ .... شیخ عارف علی۔"
عاصمہ نے اپنے نازک ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔

"خدا کے لئے عاصمہ .... مجھے پہچانو بیٹی .... میں ہی تمہارا بدنصیب باپ ہوں۔"

عاصمہ نے خشمگیں نظروں سے باپ کو دیکھا۔ پھر صبر و تحمل کے سارے بند خون کی گردش کے آگے نڈھال ہو کر رہ گئے۔ وہ سرد لہجے میں بولی۔

"آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں قبلہ .... میرا باپ کبھی بدنصیب نہیں تھا .... وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب مرد تھا جس نے ایک پھول کو مسل کر پھینک دیا اور اس کی جگہ ایک کلی کو اپنی زندگی میں بسا لیا........."

"عاصمہ .... میری بچی ...." عارف علی نے کچھ کہنا چاہا تو عاصمہ بپھرے ہوئے طوفان کی طرح پھٹ پڑی۔

"میرا کوئی باپ نہیں ہے۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ آج سے بارہ سال پہلے مر چکا ہے۔"

عارف علی کے دل پر ایک گھونسہ لگا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عاصمہ کو دیکھتے ہوئے مضمحل آواز میں بولے۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری بچی! مجھے مرے ہوئے واقعی بارہ سال بیت چکے ہیں۔ میں نے خوشیوں سے منہ موڑ کر اپنی زندگی میں کانٹے بھر لئے ہیں' تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی چبھن کا احساس نہ ہو۔"

عاصمہ کے دل میں باپ کی محبت کے جذبے نے ایک بار پھر سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے اس جذبے کو سر اٹھانے سے پیشتر ہی سختی سے کچل کر رکھ دیا۔ اسے ماضی کی ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ ان باتوں کو بھول بھی کیسے سکتی تھی' جنہوں نے اس کے ہونٹوں سے باپ کہنے کا حق بھی چھین لیا تھا اور پھر انہی باتوں نے تو اس کی ماں کو سینی ٹوریم کی مدقوق فضا میں سانس لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ موت سے پہلے ہی موت کی تلخیوں سے روشناس کرا دیا تھا.......... زندگی کی زہرناکیوں سے ہمکنار کیا تھا۔

اور..........

یہ سب کچھ ایک باپ کی وجہ سے ہوا تھا..........

ایک مرد کی مہربانیوں کا نتیجہ تھا..........

مرد..........

جس کا دل پتھر کا ہوتا ہے..........!

عاصمہ نے بھی باپ کی طرف سے اپنا دل پتھر کر لیا تھا' اس لئے جب عارف علی نے اپنی محرومیوں کا حال الفاظ میں بیان کیا تو وہ متاثر نہ ہو سکی۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا خدانخواستہ اب ناہید بیگم سے بھی آپ کا دل اکتا گیا ہے۔"

"عاصمہ..........!" عارف علی اس چوٹ پر تڑپ اٹھے۔ ہونٹ چبا کر بولے۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں میری طرف سے غبار بھرا ہوا ہے لیکن انسان اگر سچے دل سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لے تو ایک بار خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔"

عاصمہ اس دلیل پر جھلا گئی اور سرد لہجے میں بولی۔ "اگر آپ کو خدا کی ذات پر یقین ہے تو پھر جا کر اسی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگئے.......... یہاں کس لئے چلے آئے آپ

.... یہاں تو صرف خدا کے ٹھکرائے ہوئے بندے رہتے ہیں۔"

عارف علی نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"عاصمہ! کیا یہ سچ ہے کہ شبانہ مر چکی ہے؟"

ماں کے نام پر عاصمہ تڑپ اٹھی۔ تلملا کر بولی۔

"جی نہیں' آپ کے ظلم و ستم کا شکار بھلا اتنی آسانی سے زندگی کے بکھیڑوں سے کیسے آزاد ہو سکتا ہے؟ یہ درست ہے کہ شبانہ بیگم اسی روز مر چکی تھیں جس دن انہوں نے اپنی حسرتوں اور وفاؤں کے لاشے کو کاندھے پر اٹھا کر قصرِ شبانہ کی دہلیز سے قدم نکالا تھا.......... اب صرف میری ماں زندہ ہے.......... وہ ماں جس کو میرے باپ نے زندہ درگور کر دیا ہے.......... وہ ماں جو اپنی اولاد کی خوشیوں کی خاطر اپنے دل کے رِستے ہوئے ناسوروں کو چھپائے ہوئے زندہ رہنے پر مجبور ہے۔"

عاصمہ روانی میں جو کچھ منہ میں آیا کہے جا رہی تھی اور عارف علی حسرت و یاس کی تصویر بنے کھڑے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر جب عاصمہ خاموش ہوئی تو انہوں نے کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا میں شبانہ کو صرف ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟"

عاصمہ نے حقارت سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں دیکھ سکتے.......... ابھی وہ رشتے ٹوٹے تو نہیں جو مکر و فریب کی بنیادوں پر قائم کئے گئے تھے.......... وہ ڈور ابھی باقی ہے جس میں ایک عورت کی وفا کو جکڑ کر تڑپنے پر مجبور کیا گیا تھا.......... وہ شکار بھی ابھی زندہ ہے جو لاکھوں زخم کھانے کے باوجود مر نہ سکا اور ابھی شاید مرد کے انتقام کو تسکین بھی نہیں پہنچی.......... ابھی اس کے ترکش میں کچھ اور زہریلے تیر بھی باقی ہیں.........."

"عاصمہ..........!" عارف علی کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ اٹھے۔ "بس کرو عاصمہ.......... خدا کے لئے بس کرو.......... مجھے خود اپنی نظروں میں اتنا ذلیل نہ کرو کہ میں گھبرا کر خودکشی کر لوں۔"

"خودکشی.........." عاصمہ نے نفرت سے کہا۔ "خودکشی تو مجبوریوں کی انتہا کا دوسرا نام ہے.......... آپ تو مرد ہیں اور مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا.......... پھر آپ کے پاس تو دولت کی بھرمار بھی ہے' جو زندگی کو نئی نئی خوشیاں فراہم کرنے کا سب سے بڑا اور واحد

ذریعہ ہے۔ شبانہ بیگم اور ناہید بیگم کے علاوہ کسی اور زندگی کا سودا بھی کیا جا سکتا ہے.........."

عارف علی نے نظریں جھکائیں۔ عاصمہ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کی دل کی گہرائیوں میں تیر و نشتر بن کر چبھ رہا تھا لیکن وہ مجبور تھے' حالات نے انہیں کس قدر بے بس کر دیا تھا۔

بڑی دیر تک وہ یوں ہی گردن جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ پھر ڈبڈبائی ہوئی نظریں اٹھا کر عاصمہ کو دیکھ کر بولے۔

"عاصمہ! اگر تم نہیں چاہتی کہ میں شبانہ سے ملوں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی منحوس صورت لے کر اس دروازے پر نہیں آؤں گا لیکن .... لیکن مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ کس حال میں ہے؟"

عاصمہ کے قدم باپ کی رندھی ہوئی آواز سن کر لڑکھڑانے لگے لیکن وہ سنبھل گئی۔ ان آنسوؤں کو پی گئی جو بار بار پلکوں کی اوٹ سے بہہ نکلنے کے لئے مچل رہے تھے۔ ضبط کر کے سرد لہجے میں بولی۔

"کیا آپ کو صرف یہ جان کر کوئی خوشی نہیں ہوئی کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔"

عارف علی کے لئے عاصمہ کا یہ جملہ اتنا کاری ثابت ہوا کہ وہ دل ہی دل میں مسوس کر رہ گئے۔ بھیگی بھیگی نگاہوں سے عاصمہ کو دیکھا۔ کتنی حسرت ٹپک رہی تھی ان نمناک نظروں میں۔ کتنے افسانے چھپے ہوئے تھے ان آنسوؤں کے قطروں میں جو ان کی پلکوں میں جھلملا رہے تھے۔ کس قدر شرمندگی کا احساس جھلک رہا تھا' لیکن عاصمہ آہنی چٹان کی طرح جمی کھڑی رہی۔ اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ تھا تاکہ باپ کی محبت کہیں ماضی کی تلخیوں پر غالب نہ آ جائے' لیکن جب عارف علی چلے گئے تو وہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ طوفان جو اس نے سینے کی گہرائیوں میں دبا رکھا تھا پھٹ پڑا۔ آنسوؤں کا سیلاب جسے ضبط کے پشتوں سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی ہر رکاوٹ کو اپنے اندر خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

کرب میں ڈوبی ہوئی ایک سرد آہ اس کے ہونٹوں تک آ ہی گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..........

سسکنے لگی..........

مرغ بسمل کی طرح تڑپتی رہی ....

ماہئ بے آب کی طرح مچلتی رہی .... لیکن..........

اس کے دل کو تسلی دینے والا کوئی نہ تھا..........

اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا..........

کتنی بے یار و مددگار بن کر رہ گئی تھی وہ..........!

☆======☆======☆

عاصمہ تمام دن بستر پر پڑی روتی رہی۔

عارف علی کی آمد نے ماضی کے ان زخموں پر نشتر کا کام کیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بھرنے لگے تھے۔ ان چھالوں کو پھوڑ دیا تھا جو بھر رہے تھے اور زخم جب تازہ ہوئے تو ان کی تکلیف نے عاصمہ کو بے چین کر دیا۔

جب تک وہ باپ سے گفتگو کرتی رہی اس کے خیالوں میں ماں کی بیماری چھائی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ شبانہ بیگم نے غم جھیلتے جھیلتے اپنی جوانی تباہ کر ڈالی ہے' لیکن زباں سے کبھی اُف تک نہ کی۔ مبادا عاصمہ یا آصف کو اپنی بیچارگی کا احساس ہوتا اور اسی خیال نے عاصمہ کو باپ کی شخصیت سے متنفر کر دیا تھا' لیکن عارف علی آنکھوں میں حسرت و یاس لئے بے نیل و مرام اس کی دہلیز تک آ کر واپس چلے گئے تو عاصمہ کا دل تڑپ اٹھا' وہ صبر نہ کر سکی اور پھوٹ پڑی۔

آج اسے قصرِ شبانہ میں گزارے ہوئے وہ حسین لمحات رہ رہ کر یاد آ رہے تھے جب زندگی میں ہر طرف بہار ہی بہار تھی اور رنج و غم کا احساس تک اس کے ذہن میں کبھی نہ اُبھرا تھا۔

مگر..........

وقت کی ایک ہی کروٹ نے اور حالات کی ایک ہی انگڑائی نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ ہر شے تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔

عاصمہ نے تمام دن رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا' اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے تھے۔ چہرے پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ حُسن کس قدر سوگوار سا لگ رہا تھا۔

شام کو آصف اسکول سے واپس آیا تو بہن کی حالت دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا آج پہلا اتفاق تھا جب اس نے اپنی بہن کو اس اجڑی اجڑی

حالت میں دیکھا تھا۔ کچھ دیر خاموشی سے گنگ کھڑا وہ بہن کو دیکھتا رہا جو اپنے بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ پھر قریب جا کر پوچھا۔

"آپی! کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے کچھ؟"

عاصمہ نے متورم آنکھیں کھول کر بھائی کو دیکھا تو ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل کو دھچکہ سا لگا اور وہ سوچنے لگی۔ آصف کس قدر بدنصیب ہے۔ اسے بھلا کیا معلوم کہ آج اس کا باپ اس کے دروازے تک آ کر خالی ہاتھ لوٹ گیا تھا۔

آصف نے بہن کی آنکھوں کو نمناک دیکھا تو بے چینی سے بولا۔

"آپی! آپ کو کیا ہو رہا ہے' کیوں رو رہی ہیں آپ؟"

عاصمہ نے آصف کی پریشانی کے خیال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں .... طبیعت آج صبح سے ہی کچھ خراب ہے .... تم جا کر منہ ہاتھ دھو لو' میں اٹھ کر تمہیں کھانا دیتی ہوں۔"

اور پھر جب عاصمہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے یوں لگا جیسے جسم کی ساری طاقت سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

آصف نے آگے بڑھ کر بہن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے یوں لگا تھا جیسے اس نے کسی دہکتے ہوئے توے کو چھو لیا ہو' گھبرا کر بولا۔

"ارے آپی! آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔"

عاصمہ نے آصف کو دیکھا پھر محبت سے بولی۔

"یوں ہی معمولی سی حرارت ہو گی' تم جا کر منہ ہاتھ دھو لو' میں کھانا تیار کرتی ہوں۔"

"نہیں آپی! آپ لیٹی رہیے۔ مجھے اس وقت کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔"

"پگلے' میری وجہ سے بھوکا رہے گا۔" عاصمہ کے ہونٹوں پر ایک پھیکے سے تبسم نے مچل کر دم توڑ دیا۔

آصف نے کہا۔

"جب میں اسکول گیا تھا اس وقت تو آپ بالکل ٹھیک تھیں۔ پھر یہ اچانک آپ کی طبیعت کیسے بگڑ گئی؟"

عاصمہ نے تلخی بھری مسکراہٹ کے ساتھ جھوٹ بولا۔

"تمہیں وہم ہو گیا ہے آصف! مجھے معمولی سی حرارت ہے کچھ دیر میں جاتی رہے گی۔"

آصف نے بہن کے چہرے کو بغور دیکھا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں آپی! ضرور کوئی بات ہے جو مجھ سے آپ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

"اچھا .... پھر تم ہی بتاؤ وہ بات کیا ہو سکتی ہے؟" عاصمہ نے اسے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"آپی! کہیں سینی ٹوریم سے کوئی بری اطلاع تو نہیں آئی ہے۔"

"آصف........." عاصمہ تڑپ اٹھی۔ "خدا کے لئے ایسی منحوس فال منہ سے نہ نکالو۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"کہہ تو دیا کہ کوئی بات نہیں ہے۔" عاصمہ جھلا گئی اور پھر آصف کے منع کرنے کے باوجود وہ ہمت کر کے اٹھی' باورچی خانے میں جا کر چائے بنائی۔ صبح کے پراٹھے بچے رکھے تھے' انہیں گرم کر کے کے آصف کو دیا پھر دوبارہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی۔

بخار کی شدت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچتی رہی۔

اپنے ماضی کے بارے میں............

ماضی .... جو زندگی کی بے پایاں مسرتوں کا گہوارہ تھا............

حال..........

جس میں ہر طرف تلخیاں ہی تلخیاں بکھری ہوئی تھیں .... اور

مستقبل..........؟

نہ جانے کیا ہو گا..........!

کیسا ہو گا..........!

عاصمہ نے کراہ کر کروٹ بدلی۔ اس کا پورا جسم بخار کی شدت سے ٹوٹ رہا تھا۔ حلق بُری طرح خشک ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ اٹھ کر ایک گھونٹ پانی پی لے' لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھیں۔ آصف کو آواز دینے کا خیال آیا لیکن اس نے یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ڈر تھا کہ کہیں آصف اس کی حالت دیکھ کر گھبرا نہ جائے اور پھر وہ دوبارہ ماضی حال اور

مستقبل کے تانے بانوں میں الجھ کر رہ گئی' اور پھر اس کا ذہن آہستہ آہستہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ غم کی شدت نے اسے نڈھال کر ڈالا تھا۔

تمام رات وہ بے ہوش رہی..........

صبح جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا نسیمہ بیگم اس کے سرہانے بیٹھی بڑی شفقت سے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ آصف بھی قریب موجود تھا۔ عاصمہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو نسیمہ بیگم اسے منع کرتے ہوئے بولیں۔

"لیٹی رہو بیٹی! ڈاکٹر نے تم کو آرام کرنے کو کہا ہے۔"

"ڈاکٹر..........!" عاصمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی! تم شاید اس وقت بے ہوش تھیں اس لئے تم کو خبر نہیں ہوئی۔" نسیمہ بیگم نے بڑی حلیمی سے کہا۔ "ہم نے رات ہی ڈاکٹر کو بلا کر تمہیں دکھایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے معمولی بخار ہے شام تک اللہ نے چاہا تو جاتا رہے گا۔"

آصف نے بہن کے قریب آ کر پوچھا۔

"آپی! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

عاصمہ نے دیکھا کہ آصف کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں شاید وہ تمام رات نہیں سویا تھا۔ پلکوں پر ہلکی ہلکی نمی سی بھی موجود تھی۔

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں آصف!" اس نے آصف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے خواہ مخواہ سب کو تکلیف دی۔"

نسیمہ بیگم نے کہا۔

"اے بیٹی' اس میں بھلا تکلیف کی کون سی بات ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ مجھے تو بلکہ تم سے شکایت ہے کہ تم نے پہلے نہیں کہلوایا ورنہ میں شام ہی کو آ جاتی۔"

عاصمہ نے خالی خالی نظروں سے نسیمہ بیگم کو دیکھا لیکن جواب نہ دیا۔ نسیمہ بیگم نے اسے لیٹے رہنے کی ہدایت کی اور اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں تو عاصمہ نے آصف سے پوچھا۔

"یہ خالہ جان کب سے آئی ہوئی ہیں؟"

"رات سے یہیں ہیں۔" آصف بولا۔ "ثاقب بھائی بھی تمام رات جاگتے رہے۔"

"کیا ثاقب بھی یہاں آئے تھے؟" عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔

"وہی تو میرے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو لائے تھے۔" آصف نے کہا۔ "رات کو دو بار ڈاکٹر آیا تھا۔ آپ کو سوئی بھی لگائی گئی تھی لیکن آپ اس وقت بھی بے ہوش تھیں۔"

"کیا ثاقب بھی تمام رات اسی کمرے میں رہے ہیں؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"ہاں آپی! میں نے بہت کہا کہ وہ گھر جا کر آرام کریں لیکن وہ کسی طرح بھی نہیں مانے۔ خالہ جان کا کہنا بھی ٹال دیا اور اب صبح کو یہ کہہ کر گئے ہیں کہ آفس میں کچھ ضروری کام ہے اسے نپٹا کر جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔"

عاصمہ نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

ثاقب اور نسیمہ بیگم کے سلسلہ میں وہ شروع سے ہی محتاط سی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کا احسان لے' لیکن وقت کی نزاکت نے اس وقت اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

آصف نے بہن کے قریب بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپی! ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کی حالت کسی اچانک صدمہ کی وجہ سے خراب ہوئی ہے۔"

"خیال ہے ڈاکٹر کا' ورنہ مجھے کیا صدمہ ہو سکتا ہے؟" عاصمہ نے آصف کو ٹالنے کی خاطر کہا۔ پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر کی فیس وغیرہ کس نے دی تھی؟"

"ثاقب بھائی نے دی ہو گی۔"

"تم نے پوچھا نہیں ان سے؟"

"مجھے اتنا دھیان ہی نہیں تھا کہ ان سے کچھ پوچھتا۔"

"ڈاکٹر صاحب اب آئیں تو تم ان سے ضرور پوچھ لینا۔" عاصمہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں دوسروں کا احسان لینا پسند نہیں کرتی۔"

آصف کے جواب دینے سے پہلے ہی نسیمہ بیگم گرم گرم دودھ اور مکھن لگے توس لئے آ گئیں۔ عاصمہ کو ان کے اصرار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ دو توس کھا کر اس نے دودھ کا کپ پیا پھر دوبارہ لیٹ گئی۔ آصف ٹرے لے کر چلا گیا تو نسیمہ بیگم بستر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو میری وجہ سے اتنی زحمت اٹھانی پڑی۔" عاصمہ نے دبی دبی زبان میں کہا۔

"کیوں غیریت کی باتیں کر رہی ہو بیٹی؟" نسیمہ بیگم بولیں۔ "اوّل تو مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی' پھر بیماری دکھ میں کسی کے کام آنا تو انسان کا فرض ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب آپ جا کر آرام کریں۔ تمام رات جاگتی رہی ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں ساری رات جاگتی رہی ہوں؟" نسیمہ بیگم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آصف بتا رہا تھا۔"

"بڑا نیک اور سعادت مند بچہ ہے۔ رات جس وقت وہ گھبرایا ہوا آیا تو میں ڈر گئی تھی کہ خدا جانے کیا خبر ہو گی۔ بعد میں تمہاری بیماری کا پتہ چلا تو دل کو قدرے اطمینان ہوا۔"

"آپ نے ناشتہ کر لیا یا نہیں؟" عاصمہ نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"چائے پی لی ہے۔" نسیمہ بیگم بولیں۔ "ناشتے کی خواہش نہیں ہے۔"

گیارہ بجے تک نسیمہ بیگم عاصمہ کے پاس رہیں پھر یہ کہہ کر چلی گئیں کہ وہ پھر کسی وقت پوچھنے آئیں گی۔ عاصمہ کا بخار بالکل اتر چکا تھا۔ صرف نقاہت سی باقی رہ گئی تھی۔

آصف بہن کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"آپی! ثاقب بھائی بیچارے بڑے اچھے آدمی ہیں۔ رات جس وقت میں آپ کی بیماری کا حال کہنے گیا تو وہ سو رہے تھے' لیکن ملازم نے انہیں فوراً ہی جگا دیا اور وہ بے چارے اسی وقت تیار ہو کر میرے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلے گئے۔"

عاصمہ نے آصف کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے امتحانات شروع ہونے میں اب کتنے دن رہ گئے ہیں؟"

"ایک ہفتہ اور باقی رہ گیا ہے۔"

"کورس تیار کر لیا ہے؟"

"آپ اس کی فکر نہ کریں آپی! میں بڑی محنت سے تیاری کر رہا ہوں۔ اوّل آ کر دکھاؤں گا آپ کو۔"

"خدا تمہیں کامیاب کرے۔" عاصمہ نے دعا دیتے ہوئے کہا۔

"آپی! ثاقب بھائی کا مشورہ ہے کہ میں میٹرک کرنے کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لوں۔"

"پہلے میٹرک کر لو پھر سوچیں گے۔"

"بیچارے میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔" آصف نے ثاقب کا تذکرہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دفتر سے آتے ہی مجھے پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ثاقب کے سلسلے میں سوچ رہی تھی کہ کیا آصف کے ساتھ ان کا برتاؤ محض انسانی ہمدردی کا نتیجہ ہے یا اس میں بھی اسی لالچ کو دخل ہے کہ وہ عاصمہ کو پا لینے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

ایک دو بار عاصمہ نے سوچا تھا کہ آصف کو ثاقب سے نہ ملنے کی تاکید کر دے' لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی تھی کہ خدا جانے آصف اس کا کیا مطلب سمجھ بیٹھے۔ مگر اب وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ نسیمہ بیگم اور ثاقب کے ساتھ اس کے گھرانے کا میل جول مناسب نہیں ہے۔ اس نے اس بات کا ارادہ بھی کر رکھا تھا کہ اگر شبانہ بیگم نے گھر آنے کے بعد کبھی ثاقب کا تذکرہ چھیڑا تو وہ کھلے الفاظ میں شادی سے انکار کر دے گی۔

عاصمہ انہی خیالات میں گم تھی کہ باہر سے ہارن کی آواز سنائی دی اور اس کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔

"شاید ثاقب بھائی آ گئے۔" آصف یہ کہتا ہوا تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا تو عاصمہ کا دل نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ اس نے جلدی سے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹ کر اوپر کیا پھر دوپٹہ سر پر ڈال لیا۔

ثاقب تنہا نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ عاصمہ نے ان دونوں کو اندر آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ نہ جانے کیوں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر محض ایک بار ثاقب کے چہرے کا جائزہ لیا پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"ماشاء اللہ .... اب تو آپ بالکل ٹھیک نظر آ رہی ہیں۔" ڈاکٹر نے عاصمہ کے قریب آ کر کہا' پھر نبض دیکھ کر بولا۔ "بخار اب بالکل نہیں ہے۔ کمزوری ہے وہ بھی ایک دو روز کے آرام سے جاتی رہے گی۔ میں ایک ٹانک لکھے دیتا ہوں' اس کے استعمال سے آپ کو فائدہ پہنچے گا۔"

پھر ڈاکٹر کے ساتھ ہی ثاقب بھی باہر چلا گیا۔ عاصمہ نے آصف کو اشارہ سے کہا کہ وہ

ڈاکٹر سے جا کر اس کی فیس کے بارے میں دریافت کر لے۔ تھوڑی دیر بعد جب آصف اور ثاقب دوبارہ کمرے میں آئے تو عاصمہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ ثاقب کچھ اداس اداس ہے۔ اس کے چہرے پر وہ شگفتگی نہیں تھی جو ڈاکٹر کے سامنے عاصمہ نے دیکھی تھی۔ آصف کے چہرے پر بھی سنجیدگی طاری تھی۔

عاصمہ نے ثاقب کو دیکھ کر ایک ادائے بے رخی سے اپنی توجہ دوسری طرف کر لی تھی۔ اسے ایک لمحے کے لئے خیال آیا تھا کہ ثاقب سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھ لے' لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا' وہ ثاقب سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔

ثاقب کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا اپنے خیالوں میں گم رہا پھر اس نے نظر اٹھا کر عاصمہ کو دیکھا اور دبی زبان میں کہا۔

"کیا ڈاکٹر کی فیس معلوم کرنے کی ہدایت آپ نے کی تھی۔"

عاصمہ نے پلٹ کر ثاقب کو دیکھا پھر مدھم آواز میں بولی۔

"جی ہاں.........."

"آپ شاید اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی ہیں کہ آصف کو میں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح چاہتا ہوں۔" ثاقب کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

"یہ آپ کا حُسنِ سلوک ہے جو آپ ایسا سمجھتے ہیں لیکن ڈاکٹر کی فیس کا تعلق براہِ راست میری ذات سے ہے۔" عاصمہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"رات آپ ہوش میں ہوتیں تو ممکن تھا میں فیس دینے کی جسارت نہ کرتا' لیکن اب بات کچھ معیوب سی لگتی ہے کہ آپ.........."

"ثاقب صاحب.........." عاصمہ تیزی سے بولی۔ "آپ نے اور آپ کی والدہ محترمہ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے' میں اس کے لئے احسان مند ہوں لیکن دوسروں پر بار بننا میری فطرت کے خلاف ہے۔"

"میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"آپ نے ڈاکٹر کو جو فیس دی ہے وہ لے لیں' نوازش ہو گی۔" اس بار عاصمہ نے قدرے روکھائی سے کہا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر کو کوئی فیس نہیں دی گئی تو.........."

"میں اسے غلط بیانی سمجھوں گی اس لئے کہ ابھی آپ اس بات کا اعتراف کر چکے

ہیں کہ میری بے ہوشی کی وجہ سے فیس کی ادائیگی آپ کو کرنی پڑی تھی۔"

"وہ میرا فرض تھا۔" ثاقب نے کہا۔

"یہ میری خوشی ہے کہ آپ وہ رقم مجھ سے لے لیں۔" عاصمہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"اجازت ہو تو ایک سوال کرنے کی جسارت کروں۔" ثاقب نے کچھ تامل کے بعد کہا۔

"فرمائیے!"

"کیا آپ مجھ کو بالکل ہی غیر سمجھتی ہیں۔"

عاصمہ نے اس سوال پر نظر اٹھا کر ثاقب کو حیرت سے دیکھا پھر خشک لہجے میں بولی۔

"غیریت اور اپنائیت کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی وابستگی کو دخل ہو۔"

"انسانی قدریں بھی تو آخر کوئی مفہوم رکھتی ہیں۔" ثاقب نے ہمت کی۔

"میں فرسودہ فلسفوں اور افسانوی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔" عاصمہ نے نفرت سے جواب دیا۔

"نہ سہی' لیکن انسانوں کو ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا لازم ہے۔" ثاقب بولا۔ "آپ نہیں جانتیں کہ اگر آپ نے فیس کی ادائیگی کے مسئلہ کو سنجیدگی کا رخ دیا تو مجھے کتنا افسوس ہو گا۔"

"افسوس.......... وہ کس لئے؟" عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔

"میں اس کی وضاحت سے قاصر ہوں لیکن.........."

"جو بات ناقابلِ وضاحت بن جائے وہ میرے نزدیک مہمل ہوتی ہے۔" عاصمہ نے ہونٹ چباتے ہوئے ترش روی سے کہا۔

ثاقب نے حیرت سے عاصمہ کو دیکھا پھر جلدی سے بولا۔ "آپ میرے جملے کا غلط مفہوم نکال بیٹھی ہیں' ورنہ.........."

"اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔" عاصمہ نے اس بار بھی ثاقب کی بات کو درمیان سے اچکتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "مناسب یہی ہو گا کہ آپ ڈاکٹر کی فیس قبول کر لیں۔"

"اگر آپ مجبور کر رہی ہیں تو میں انکار کی ہمت نہیں کروں گا۔" ثاقب نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اداس لہجے میں جواب دیا۔

عاصمہ نے اٹھ کر الماری کھولی اور ثاقب کے مطلوبہ روپے اس کو دے دیئے۔

آصف بدستور چپ چاپ سا کھڑا تھا۔ اسے بہن کے رویے اور روکھے برتاؤ سے تکلیف ہوئی تھی، لیکن وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا خاموش کھڑا سوچتا رہا کہ آخر بہن کے اس برتاؤ کی کیا وجہ ہے۔

ثاقب نے روپے لیتے وقت ایک بار پھر عاصمہ کے چہرے پر چھائی ہوئی تلخی کو بغور دیکھا۔ پھر روپے لے کر جیب میں رکھے اور دبی زبان میں بولا۔

"ڈاکٹر نے جو ٹانک لکھا ہے وہ آصف کو بھیج کر ابھی منگوا لیجئے گا۔ آپ کی صحت کے لئے اس کا استعمال بے حد ضروری ہے۔"

"اس مشورے کا شکریہ .... لیکن میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کسی ٹانک کی مطلق کوئی ضرورت نہیں ہے۔" عاصمہ بدستور روکھائی سے بولی۔

"لیکن آپی! ڈاکٹر نے بھی یہی کہا ہے کہ ٹانک اشد ضروری ہے۔" آصف نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لینے کی جسارت کی۔

"ٹھیک ہے، اگر میں نے اس کی ضرورت محسوس کی تو منگوا لوں گی۔" عاصمہ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

ثاقب محسوس کر رہا تھا کہ عاصمہ اس وقت دیدہ دانستہ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی ہے ورنہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ عاصمہ بڑی بااخلاق اور اچھے رکھ رکھاؤ کی لڑکی ہے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید تمام رات بخار کی شدت میں پھنکتے رہنے سے اس کا ذہن چڑچڑا ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ قدم اٹھاتا کمرے سے باہر آ گیا۔ آصف بھی اس کے ساتھ ساتھ کمرے سے چلا گیا۔

عاصمہ کو تنہائی ملی تو وہ ایک بار پھر ثاقب کے بارے میں سوچنے لگی۔ بظاہر ثاقب کی شخصیت میں ایسی کوئی خرابی نہیں تھی کہ وہ اس سے نفرت کرتی لیکن نہ جانے کیوں جب ثاقب اس کے سامنے ہوتا تو وہ بری طرح الجھ جاتی تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی اپنے لہجے میں اور اپنے طرزِ عمل میں کوئی لچک کوئی نرمی پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

شروع شروع میں جب اس نے ثاقب کو پہلی بار دیکھا تھا تو اس کی شخصیت اس کے مردانہ حُسن، اس کے پُروقار چہرے اور اس کے رکھ رکھاؤ سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اکثر جب ثاقب کی خوبصورت گاڑی اس کے قریب سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جاتی

تو وہ دور تک اسے تکتی رہتی۔ جس روز اسکول جاتے وقت ثاقب کی گاڑی اسے نظر نہ آتی اس روز وہ کسی اندرونی جذبے کے تحت ملول سی ہو جاتی۔ طرح طرح کے واہمے اس کے ذہن کو پریشان کرتے، قسم قسم کے سوالات دماغ میں ابھرتے اور پھر دوسرے روز جب ثاقب اسے نظر آ جاتا تو اس کے ذہن سے فکر و پریشانی کے تمام بادل آپ ہی آپ چھٹ جاتے۔ اسے سکون سا میسر آ جاتا۔

ایسا سکون..........

جس کو وہ کوئی خوبصورت سا نام دینے سے قاصر تھی۔

دن یوں ہی گزرتے رہے اور پھر جب نسیمہ بیگم نے اس کے گھر آنا جانا شروع کیا اور ایک روز شبانہ بیگم نے دبی زبان میں اس بات کا اظہار کیا کہ نسیمہ بیگم کے چکر لگانے کا اصل مقصد کیا ہے تو وہ جھلا گئی۔ اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت اچانک بیدار ہو گئی۔ ماں کے سامنے اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے اوپر کسی مرد کا تسلط کسی قیمت پر برداشت نہیں کرے گی۔

شبانہ بیگم کے ساتھ قسمت نے ایک مرد کے بھیس میں جو سنگین مذاق کیا تھا عاصمہ کے دل و دماغ پر اس کا ایک ایک نقش کندہ تھا۔ زندگی کے بارہ سال اس نے دکھ سہہ سہہ کر اور پریشانیاں اٹھا اٹھا کر گزارے تھے۔ پھر بھلا وہ مرد کی اس فطرت کو کیسے بھول سکتی تھی جس نے نہ صرف اس کی بلکہ اس کی ماں کے ہونٹوں سے بھی مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔

دل میں رستے ہوئے چھالے نہ جانے کتنی بار ٹوٹے تھے۔ کتنی بار ان زخموں کو ٹھیس پہنچتی تھی اور پھر ان زخموں نے ناسور کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ماں کی زبانی اسے نسیمہ بیگم کی خواہش کا علم ہوا تو اسے ثاقب سے نفرت ہو گئی۔ وہ اسے ایک انسان کی حیثیت سے، ایک پڑوسی کے ناطے سے بہت اچھا سمجھتی تھی، لیکن ایک مرد اور ایک شوہر کی حیثیت سے قبول کر لینے پر خود کو آمادہ نہ کر سکی اور یہی وجہ تھی کہ آج بھی اس نے ثاقب کے سامنے دبی دبی زبان میں اپنی نفرت کا اعلان کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے جذبے کی قدر کرنے کے بجائے نفرت سے فراموش کر دیا تھا۔

اس کی ہمدردی کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا..........

ایسا تلخ جواب دیا تھا کہ ثاقب کی نظریں جھک گئی تھیں............

اور ....

ایک مرد کی جھکی جھکی نظریں دیکھ کر اسے کس قدر سکون ملا تھا............

کتنی مسرت ہوئی تھی اسے ایک مرد کا سرنگوں کر کے ....

اس کی انا کو بے حد تقویت پہنچی تھی۔

☆======☆======☆

شبانہ بیگم جس روز سینی ٹوریم سے گھر آئیں اس روز عاصمہ کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

حسبِ وعدہ اس نے ماں کے گھر میں آتے ہی میلاد شریف کیا تھا' محلے کی تمام عورتوں کو مدعو کیا گیا تھا' شیرینی تقسیم کرائی تھی' گئی رات تک اس کے آنگن میں ہنگامے جاری رہے۔ پھر جب محلے کی عورتیں ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں تو عاصمہ نے ماں سے لپٹ کر کہا تھا۔

"امی جان! آج میں بہت خوش ہوں۔ قدرت نے آپ کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔"

شبانہ بیگم نے عاصمہ کے چہرے پر آج ایک عرصے کے بعد شفق پھوٹتے دیکھی تھی اس لئے خوشی سے نہال ہو کر بولیں۔

"عاصمہ! یہ سب تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

عاصمہ مسکرا کر بولی۔

"میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خدا سے ہمیشہ یہی دعا کرتی تھی کہ میری پیاری پیاری امی جان کو اچھا کر دے۔"

شبانہ بیگم نے بڑی محبت سے عاصمہ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"سچ ہے بیٹی! انسان اگر سچے دل سے خدا کو یاد کرے تو وہ اس کی ضرور سن لیتا ہے۔ جو سچ پوچھو تو مجھے امید نہیں تھی کہ دوبارہ اس گھر کی صورت بھی دیکھ سکوں گی' لیکن تمہاری اور آصف کی معصوم دعاؤں نے مجھے موت کے منہ سے چھین لیا۔"

عاصمہ ٹھنک کر بولی۔

"اب اگر کبھی آپ نے مایوسی کی بات کی تو میں رو پڑوں گی۔"

شبانہ بیگم نے کہا۔

"اللہ نہ کرے جو تم کو میری زندگی میں کبھی آنسو بہانے کی نوبت آئے۔"

عاصمہ نے ماں کو خوش دیکھا تو لاڈ سے کہا۔

"امی جان! آج آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"یوں نہیں' پہلے آپ وعدہ کیجئے کہ جو کچھ میں کہوں گی آپ اسے مان لیں گی۔"

"بات کیا ہے آخر' کچھ معلوم بھی تو ہو۔"

"نہ .... پہلے وعدہ کیجئے کہ جو کچھ میں کہوں گی آپ اسے مان لیں گی۔"

"اچھا.......... چلو وعدہ کرتی ہوں کہ اگر ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مان لوں گی۔"

عاصمہ نے ماں کے چہرے کو پیار بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔

"امی جان! میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ گزری ہوئی باتوں کو یکسر فراموش کر دیں ورنہ آپ کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔"

شبانہ بیگم نے وعدہ کرنے کو تو کر لیا لیکن وہ جانتی تھیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہیں ناممکن ہے۔ اپنے ماضی کو بھول جانا اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو آج یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔

عارف علی کو تو انہوں نے اپنا مجازی خدا سمجھ کر ان کی پرستش کی تھی۔ شوہر کے ہر حکم کو اپنا ایمان سمجھا تھا۔ شوہر کی ہر خوشی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ پھر بھلا وہ عارف علی اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے زندگی کے خوشگوار لمحات کو کیسے بھول سکتی تھیں۔

عاصمہ اور آصف کی خاطر انہوں نے اپنے سینے پر صبر کی سل ضرور رکھ لی تھی لیکن فرقت کے ان بارہ سالوں میں کوئی ایک ایسا لمحہ نہیں آیا تھا جب انہوں نے شوہر کی یاد کو بھلانے کی کوشش کی ہو۔ انہیں آج بھی وہ دن یاد تھا جب اپنے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے ان کے باپ نے انہیں سینے سے لگا کر کہا تھا:

"شبانہ بیٹی! آج سے تم ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہی ہو۔ میری نصیحت ہے کہ شوہر کے گھر کو اب اپنا گھر سمجھنا' اپنی ساس اور سسر کو ماں باپ کی

طرح ہر سکھ اور آرام پہنچانے کی کوشش کرنا۔ شوہر کی حیثیت مجازی خدا کی ہوتی ہے اس لئے اگر تم نے کبھی اپنے شوہر کو ناراض کیا تو سمجھ لو کہ دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو جائے گی۔"

اور شبانہ بیگم نے باپ کی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔ آج تک اسی نصیحت پر عمل کر رہی تھیں۔ جب تک وہ شوہر کے گھر میں تھیں اس وقت بھی انہوں نے عارف علی کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا اور آج..........

آج بھی ان کا دل شوہر کی محبت سے معمور تھا۔ وقت نے انہیں اپنے مجازی خدا سے دور ضرور کر دیا تھا لیکن آج بھی وہ عارف علی کو دل میں بسائے ان کی پرستش کر رہی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ شوہر کی جدائی کے غم نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ گزرے ہوئے حسین لمحات کی یاد اب بھی کبھی کبھی ان کے دل پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتی تھی۔ دل کے زخم ہرے ہو جاتے تھے مگر آج تک کبھی وہ عارف علی کے خلاف کوئی حرفِ شکایت زبان تک نہیں لائی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ شوہر کے لئے اپنے خدا سے یہی دعائیں مانگی تھیں کہ وہ جہاں بھی رہیں جس حال میں بھی رہیں' خوش رہیں۔

عاصمہ ماں کے وعدے پر گلاب کی کسی نوخیز کلی کی طرح کِھل اٹھی۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک اٹھا۔ جھک کر اس نے بڑی عقیدت سے ماں کی پیشانی کو چوم لیا۔ وہ اپنی کامیابی پر بے حد مسرور تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ آج اس نے ماں کے دکھ درد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے' لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ دنیا میں کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دور رہ کر بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو انسان کے وجود سے گھن کی طرح چمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ دیمک بن کر اندر ہی اندر انسانی وجود کو کھاتی رہتی ہیں۔ کھوکھلا کرتی رہتی ہیں اور پھر ایک دن اسے فنا کر دیتی ہیں۔

ہر نقش مٹ جاتا ہے..........
ہر شے اپنا وجود کھو دیتی ہے..........
لیکن یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں..........
انہیں کوئی نہیں مٹا سکتا..........

شبانہ بیگم نے عاصمہ کے گلنار چہرے کو دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔

"میں نے تمہاری بات کتنی جلدی مان لی' اب تو خوش ہو نا!"

عاصمہ خوشی سے سرشار ہو کر بولی۔

"آپ کتنی اچھی ہیں امی جان!"

"عاصمہ!" شبانہ بیگم نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کچھ میں بھی مانگوں تم سے؟"

عاصمہ نے ماں کی آنکھوں میں امیدوں کے روشن سائے لہراتے دیکھے تو یکلخت سہم کر رہ گئی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک دم ہی معدوم ہو کر رہ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ماں کیا کہنے والی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ماں کی دلی خواہش کیا ہے۔

اس نے سوچا ماں سے کھلے لفظوں میں انکار کر دے۔ صاف صاف کہہ دے کہ وہ دنیا کے ہر ظلم و ستم کو خوشی خوشی برداشت کرنے کو تیار ہے لیکن مرد کے تسلط کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کر سکتی' لیکن اسے خدشہ تھا کہ اس کا جواب ماں کے دل کی حالت پر اثر انداز ہو گا چنانچہ بات ٹال کر بولی۔

"امی جان! ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ کچھ عرصے کے لئے آپ کو کسی پہاڑی مقام پر چلا جانا چاہئے۔ کھلی ہوئی فضا آپ کے لئے بے حد فائدہ مند ثابت ہو گی۔"

شبانہ بیگم اتنی بچی تو تھیں نہیں کہ عاصمہ کی باتوں میں آ جاتیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ عاصمہ انہیں ٹالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پہلے بھی انہوں نے بارہا دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن عاصمہ اسی طرح بات اڑا گئی تھی۔

"عاصمہ! تم یہی چاہتی ہو نا کہ میں خوش رہوں۔"

"یہ میری زندگی کی سب سے افضل تمنا ہے' امی جان!"

"پھر تم مجھے ٹالنے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟" شبانہ بیگم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ کو وہم ہوا ہو گا۔" عاصمہ جلدی سے بولی۔ "میں بھلا آپ کو ٹالنے کی کوشش کروں گی؟"

"نسیمہ بیگم آج بھی مجھ سے اصرار کر رہی تھیں۔" شبانہ بیگم نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میری سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اپنی زندگی میں تمہارے ہاتھ پیلے کر دوں۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ تو میرے سر سے غموں کا ایک بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوچوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

"تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔" شبانہ بیگم نے دوبارہ کہا تو عاصمہ چپ

نہ رہ سکی۔

"امی جان! میں آپ کی ہر خوشی کا احترام اپنا فرض سمجھتی ہوں لیکن اتنی جلدی کیا ہے حالات سازگار ہو جائیں تو جو دل چاہے کر لیجئے گا۔"

"یہی بات میں نے بھی نسیمہ بیگم سے کہی تھی۔" شبانہ بیگم نے کہا۔ "لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہیں صرف لڑکی درکار ہے۔ مال و دولت کی کوئی طمع نہیں ہے۔"

"پھر بھی دنیا کو دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" عاصمہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں جانتی ہوں لیکن اچھے رشتے بھی تو بار بار نہیں ملا کرتے۔" شبانہ بیگم نے جواب دیا۔ "میں نے نسیمہ بیگم کو کوئی آخری جواب نہیں دیا مگر اتنا ضرور کہہ دیا ہے کہ شادی میں کوئی دھوم دھڑکا نہیں ہو گا۔ رسمیں جتنی سادگی سے ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔"

عاصمہ کچھ سوچ کر بولی۔

"امی جان! آپ شاید اس بات کو فراموش کر رہی ہیں کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ ہمارا ان کا بھلا کیا جوڑ' اور پھر مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند بھلا کب اچھا لگتا ہے۔"

"خدا نہ کرے کہ تم .... ٹاٹ کا پیوند ہو۔" شبانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ "نسیمہ بیگم تو تم پر ایسی ریجھی ہیں کہ وہ ہماری ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔"

"سوڈے کی ابال دیرپا نہیں ثابت ہوتی امی جان!"

عاصمہ نے کہا تو شبانہ بیگم ایک لمحے کے لئے ماضی کی تلخ یادوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

عارف علی کے گھر والوں نے بھی انہیں حاصل کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ سارے ہی جتن کر ڈالے تھے۔ منتیں کی تھیں خوشامدیں کی تھیں' لیکن بعد میں کیا ہوا

..........کیا ملا انہیں..........

شوہر کی بے وفائی..........

دربدر کی خاک..........

اور گہرے گھاؤ جو ابھی تک تازہ تھے..........

یہ سب کچھ سوڈے کی اُبال ہی تو تھی۔

شبانہ بیگم کچھ دیر تک سوچتی رہیں پھر جب دل کے وسوسوں پر قابو پا لیا تو پیار سے

بولیں۔

"عاصمہ! پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔"

عاصمہ نے ماں کے چہرے پر ماضی کی تلخ یادوں کے سائے ابھرتے دیکھے تو دل ہی دل میں کانپ اٹھی۔ مسکرا کر بولی۔

"امی جان! آپ نے میری بات کا غلط مفہوم لیا ہے۔"

"کیا تم مجھے اتنا ہی نادان سمجھتی ہو کہ میں اب تمہاری باتوں کا مطلب بھی نہ سمجھ سکوں گی۔" شبانہ بیگم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ درست ہے کہ قدرت نے میری جھولی میں آنسو بھر دیئے ہیں لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ میری بدنصیبی تمہارے مستقبل پر بھی اثر انداز ہو۔"

"خدا کے لئے ایسی باتیں مت کیجئے امی جان!" عاصمہ تڑپ کر بولی۔ "کون کہتا ہے آپ بدنصیب ہیں۔ ہم اور آصف جو آپ کا سہارا ہیں تو پھر آپ کو کس بات کا غم ہے؟"

شبانہ بیگم سرد آہ بھر کر بولیں۔

"مجھے کسی بات کا غم نہیں ہے۔ بس یہی ایک تمنا ہے کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ' لیکن تمہیں اگر میری یہ خوشی منظور نہیں ہے تو.........."

"مجھے آپ کی ہر خوشی منظور ہے۔" عاصمہ جلدی سے بولی۔ "خدا کے لئے آپ مایوسی کی باتیں نہ کیجئے۔ آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔"

شبانہ بیگم کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی لہر آ گئی۔ عاصمہ کو سینے سے لگا کر بولیں۔

"خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔ تم نے آج ممتا کی خوشیوں کی لاج رکھ لی۔ میں کل ہی نسیمہ بیگم کو بلا کر شادی کی بات طے کئے لیتی ہوں۔"

عاصمہ نے ایک بار پھر ماں کو ٹالنے کی خاطر کہا۔

"اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے لیکن اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟"

"دیر کرنے سے کیا حاصل ہو گا؟" شبانہ بیگم نے پوچھا۔

"ابھی میرے اوپر آصف کی ذمہ داری بھی ہے۔" عاصمہ بولی۔ "وہ میٹرک کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے پھر مجھے کوئی فکر نہ ہو گی۔"

"اس کے پرچے کیسے ہوئے ہیں؟" شبانہ بیگم نے پوچھا۔

"کہہ تو رہا تھا کہ اچھے ہوئے ہیں لیکن اب نتیجہ آئے تو پتہ چلے۔"

"ثاقب نے بھی اس کے ساتھ بہت محنت کی ہے۔" شبانہ بیگم نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"ارے ہاں' نسیمہ بتا رہی تھیں کہ تمہاری طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔"

"ہاں' بخار آ گیا تھا معمولی سا۔ آصف نے پریشان ہو کر ان لوگوں کو بلا لیا۔ خالہ جان کو مفت کی زحمت اٹھانی پڑی۔"

"زحمت کا ہے کی۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور پھر وہ تم کو غیر کب سمجھتی ہیں۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"نسیمہ بیگم کو تم سے ایک شکایت بھی ہے۔"

"مجھ سے .... وہ کس لئے۔" عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔

"تم نے جو ڈاکٹر کو فیس کے پیسے دیئے تھے۔"

"امی جان! خالہ جان کی شکایت قطعاً بے جا ہے۔" عاصمہ سنجیدگی سے بولی۔ "اس وقت اگر میں ہوش میں ہوتی تو کبھی دوسروں کو فیس نہ دینے دیتی۔ یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر کو لانے کی تکلیف گوارا کی۔"

"میں نے بھی انہیں یہی جواب دیا تھا۔" شبانہ بیگم نے کہا۔ پھر کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔

"آصف کا نتیجہ آنے میں ابھی کتنے دن باقی ہیں۔"

"میرا خیال ہے دس بارہ دنوں میں آ جائے گا۔ کیوں؟"

"خدا کرے وہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کی کامیابی اور تمہاری منگنی کی خوشی ایک ساتھ کروں گی۔"

عاصمہ جواب دینے کے بجائے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر صحن میں آ گئی۔ نیلگوں آسمان پر تاروں کی بارات اور ان کے درمیان شروع تاریخوں کا چاند بے حد حسین لگ رہا تھا۔ عاصمہ نے ڈبڈبائی نظروں سے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں دیکھا۔ اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی اور تاریکی میں مدغم ہو گئی۔ اسے اس وقت اپنی

بے بسی پر بے اختیار رونا آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی بے کسی پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اتنا روئے کہ پھر کبھی رونے کی تمنا باقی نہ رہے۔

شبانہ بیگم کی خوشیوں کی خاطر اس نے ثاقب کے ساتھ شادی کرنے کی ہامی بھر لی تھی' لیکن اس اقرار میں اس کے اپنے ارمانوں کو مطلق کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے تو اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹ کر وعدہ کیا تھا۔ محض ماں کا دل رکھنے کی خاطر' لیکن اب وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑی سوچ رہی تھی۔ کیا وہ اپنے وعدہ کو ایفا کر سکے گی ....

کیا وہ اپنے سینے میں مچلتے ہوئے ان طوفانوں کو دبا سکے گی جو مرد کی نفرت سے بھرپور تھے ....؟

اور ....

کیا وہ اپنی انا کو خود اپنے ہاتھوں ٹھیس پہنچا سکے گی............؟

ایک مرد کے تسلط کو چپ چاپ برداشت کر لے گی.............؟

"نہیں .... نہیں .... نہیں۔" عاصمہ کا دل تڑپ اٹھا۔ "ایسا ناممکن ہے۔ وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی۔ وہ ہر قیمت پر ماں کو سمجھانے کی کوشش کرے گی۔"

لیکن ....

اگر حالات نے اس کا ساتھ نہ دیا.......... اور

ماں کی ضد قائم رہی..........

تب کیا ہو گا..........؟

☆======☆======☆

شبانہ بیگم کی گفتگو کے بعد سے عاصمہ کو جیسے اندر ہی اندر کوئی شے گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ جب تک وہ ماں کے سامنے موجود رہتی ان کی دلجوئی کی خاطر ہنستی بولتی رہتی لیکن جب تنہا ہوتی تو پہروں سوچتی رہتی۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ رات و دن کا چکر چلتا رہا اور جوں جوں وقت کی رفتار تیز ہوتی گئی عاصمہ کی فکر و پریشانیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی۔ اس کے چہرے کی ملاحت' اداسی میں تبدیل ہو جاتی۔ آنکھوں میں ویرانیوں کے سائے ہر وقت لہراتے رہتے۔

اور ....

اب تو آصف کا نتیجہ آنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔ عاصمہ کے ذہن پر ایک بوجھ سا تھا' جو کسی طرح اتارے نہیں اترتا تھا۔ وہ ہمہ وقت ملول سی رہتی۔ دل پر جو بار تھا اسے دور کرنے کے لئے ہزاروں طریقے سوچ ڈالے تھے لیکن ابھی تک کسی آخری فیصلے پر نہیں پہنچی تھی۔

آج بھی جب وہ ضروریات سے فارغ ہو کر اسکول جانے کے لئے تیار ہوئی تو نہ جانے کیوں اس کا دل کسی اندرونی خوف سے دھڑک رہا تھا۔ ذہن میں سینکڑوں واہمے جنم لے رہے تھے' آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔

ماں کو سلام کر کے جب وہ جانے کے لئے کھڑی ہوئی تو شبانہ بیگم نے اسے روک کر کہا تھا۔

"عاصمہ بیٹی! اب تو آصف کا نتیجہ آنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔"

"جی ہاں.........." عاصمہ نے ڈوبتی آواز میں جواب دیا۔

"اللہ اسے کامیاب کرے۔" شبانہ بیگم اسے دعا دیتے ہوئے بولیں۔

"آپ مطمئن رہیں امی جان! مجھے آصف کی محنت پر مکمل اعتماد ہے' خدا نے چاہا تو وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گا۔"

"آمین!" شبانہ بیگم نے کہا پھر سوچ کر بولیں۔ "کل نسیمہ بیگم پھر آئی تھیں۔"

عاصمہ نے چونک کر ماں کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ممتا کس قدر بے چین نظر آ رہی تھی اپنے ارمانوں کی تکمیل کے لئے۔ عاصمہ کے دل پر چوٹ سی لگی' لیکن وہ خاموش رہی۔ چہرے سے اس غم کا اظہار نہ ہونے دیا جو اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کئے دے رہا تھا۔

"نسیمہ بیگم نے ثاقب سے آصف کے لئے کہا تھا۔" شبانہ بیگم نے امید و بیم کی حالت میں کہا۔ "ثاقب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آصف کا نتیجہ آتے ہی اسے اچھی ملازمت دلا دے گا۔"

"لیکن امی جان! میں چاہتی ہوں کہ آصف میٹرک کے بعد بھی اپنی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھے۔" عاصمہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

"میری خواہش بھی یہی ہے' لیکن حالات نے مجبور کر دیا ہے۔"

"ایسی بھی کیا مجبوری ہے؟" عاصمہ جلدی سے بولی۔ "میں جو کما رہی ہوں' پھر آپ

کو فکر کس بات کی ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ثاقب شاید شادی کے بعد تمہیں ملازمت جاری رکھنے کی اجازت نہ دیں۔"

ماں کے اس جملے نے عاصمہ کے زخمی دل پر نشتر کا کام کیا تھا۔ ابھی تو صرف شادی کی بات شروع ہوئی تھی۔ ابھی تو وہ اپنے گھر میں آزادی کا سانس لے رہی تھی لیکن ابھی سے ثاقب نے حکم چلانا شروع کر دیا تھا۔

"بعد میں کیا ہو گا؟" عاصمہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

کیا وہ حالات کے سامنے بے بس ہو جائے گی..........؟

کیا وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر تمام زندگی آزادی کے خواب دیکھتی رہے گی..........؟

اس کی اپنی کوئی مرضی نہ ہو گی..........؟

کوئی آرزو نہ ہو گی..........؟

کوئی تمنا نہ ہو گی..........؟

کیا وہ دوسروں کے حکم پر چلنے پر مجبور ہو جائے گی..........؟

کسی پالتو جانور کی طرح دوسروں کے اشارے پر ناچتی رہے گی..........؟

سسکتی رہے گی..........؟

بلکتی رہے گی..........؟

کیا اس کے سارے ارمان یوں ہی گھٹ گھٹ کر دل میں رہ جائیں گے..........؟

کیا وہ اپنی ذات پر ایک مرد کا تسلط برداشت کر لے گی۔

"نہیں.......... نہیں.......... نہیں۔" عاصمہ کے آہنی ارادے کروٹ لے کر بیدار ہو گئے تو اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"امی جان! یہ آصف کے مستقبل کا سوال ہے۔ میری تمنا ہے کہ جب تک وہ ایم اے تک تعلیم نہ حاصل کر لے اس کی پڑھائی میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہ پیدا ہو۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے لیکن.........."

"لیکن کیا.........." عاصمہ نے پوچھا۔ ماں کی اچانک خاموشی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"آصف ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھ سکتا ہے۔"

"یہ اس پر ظلم ہو گا امی جان!" عاصمہ تڑپ کر بولی۔

"مجبوری ہے بیٹی!" شبانہ بیگم نے کسی قدر اداس لہجے میں کہا۔ "جب تک تم اپنے گھر میں ہو اپنی مرضی کی مختار ہو' لیکن بعد میں تو وہی ہو گا جو تمہارے شوہر کی مرضی ہو گی۔"

عاصمہ کے ذہن پر یہ دوسری چوٹ تھی۔ وہ تلملا کر بولی۔

"خواہ کچھ بھی ہو' میں اس وقت تک ملازمت ترک نہیں کروں گی جب تک آصف کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی۔"

"اور اگر ثاقب نے ملازمت کرنے کی اجازت نہ دی تو!"

"مجھے آصف کا مستقبل دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔" عاصمہ نے تلخی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"خدا تمہیں ہمیشہ زندہ سلامت رکھے بیٹی' لیکن محض ایک چھوٹی سی بات کی خاطر........"

"یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے امی جان! ایک بھائی کے مستقبل کا سوال ہے۔" عاصمہ نے ماں کا جملہ کاٹ کر تیزی سے کہا۔

"اچھا' میں کسی وقت نسیمہ بیگم کے سامنے تمہاری اس خواہش کا تذکرہ کروں گی۔ دیکھتی ہوں کہ وہ کیا جواب دیتی ہیں۔"

"امی جان!" عاصمہ تلملا کر بولی۔ "کیا میری اپنی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں ہے جو آپ دوسروں سے مشورہ کریں گی۔"

"پوچھ لینے میں حرج ہی کیا ہے؟ اگر ثاقب تیار ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"ثاقب........" عاصمہ نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ پھر ماں کے چہرے کو گھورتی ہوئی مڑی اور تیزی سے باہر نکل آئی۔

اس کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا' وہ سوچ رہی تھی۔

کیا تقدیر اس کے ساتھ بھی ویسا ہی مذاق کرے گی جیسا اس کی ماں کے ساتھ پیش آ چکا تھا........؟

کیا وہ بھی مرد کے آہنی شکنجوں میں جکڑ کر بے بس ہو جائے گی اور پھر........؟

ایک دن اسے بھی اپنی امیدوں کے جنازے اپنے کندھوں پر اٹھا کر شوہر کے گھر سے قدم نکالنا پڑے گا........؟

کیا وہ بھی بے یار و مددگار ہو جائے گی........؟

کیا وہ بھی مرد کے ہاتھوں کھلونا بن جائے گی........؟

کھلونا........ جو نیا ہو تو شوکیس میں سجا لیا جاتا ہے لیکن جب پرانا ہو جائے تو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا جاتا ہے........

عاصمہ کا ذہن الجھتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انگاروں پر لوٹ رہی ہو۔ اس کے سینے میں دہکتے ہوئے شعلے اس کے پورے وجود کو جھلسائے دے رہے تھے۔ دل میں ایک آتش فشاں سلگ رہا تھا جو پھٹ کر ابل پڑنے کے لئے دھواں دے رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا تھا۔

اندھیرا........

گھپ اور تاریک اندھیرا........

جو آہستہ آہستہ اس کے وجود کے گرد دھند کا ایک خوبصورت جال بن رہا تھا۔

ہر روشنی کو اپنے دامن میں سمیٹ کر مدھم کر رہا تھا........

ہر نفس کو دھندلاتا جا رہا تھا........

اور........ اور........

عاصمہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔ سانس سینے میں پھنستی محسوس ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ اس کا ذہن چکرا رہا تھا اور پھر........

ہارن کی تیز آواز سن کر وہ یکلخت چونک اٹھی' اس کے بڑھتے ہوئے قدم ساکت ہو کر ٹھہر گئے' دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں' خواب کا طلسم ٹوٹا تو وہ حقیقت کی دنیا میں آ گئی' خیالات کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا' تنفس کی رفتار تیز ہوئی تو اس کی حسین اور کشادہ پیشانی پر پسینے کے شبنمی قطرے جھلملا اٹھے۔

اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے ماحول کا جائزہ لیا تو گھبرا گئی۔ اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ وہ فٹ پاتھ سے اتر کر کھلی سڑک پر آ گئی تھی۔ سہمی سہمی نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا تو ثاقب کی خوبصورت کار کھڑی تھی۔

ثاقب نے عاصمہ کو دیکھا تو جلدی سے کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور اس کے قریب آ کر حیرت سے پوچھا۔

"آپ.........؟"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دل کی کیفیت کو سنبھالتی لڑکھڑاتے قدم سے فٹ پاتھ پر آگئی۔

"آپ کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟" ثاقب نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا۔

"جی نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" عاصمہ نے خشک آواز میں کہا۔

"خالہ جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ثاقب نے دبی زبان میں سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

"آپ غالباً اسکول جا رہی ہیں..........؟"

"جی ہاں۔"

"کھلی سڑک پر کیسے آگئی تھیں؟"

"وہ .... وہ .... میں سڑک پار کرنا چاہ رہی تھی۔" عاصمہ نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"آپ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔" ثاقب نے کہا۔ "ورنہ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ اس وقت آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" عاصمہ روکھائی سے بولی۔

"چلئے میں چھوڑے دیتا ہوں آپ کو اسکول تک۔"

"شکریہ!" عاصمہ نے ثاقب کی طرف دیکھے بغیر سرد مہری سے جواب دیا۔

"بہت زیادہ ناراض ہیں آپ مجھ سے؟" ثاقب کے ہونٹوں پر بڑی دلآویز مسکراہٹ ابھر آئی۔ گھبرائی گھبرائی پریشان سی عاصمہ اس وقت اسے ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

"آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں ناراض ہوں۔" عاصمہ پوچھ بیٹھی۔

"ممکن ہے ڈاکٹر کی فیس کی ادائیگی آپ کو ناگوار گزری ہو۔"

"آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس قرض کو ادا کر چکی ہوں۔" عاصمہ نے تیزی سے

گھوم کر ثاقب کی طرف دیکھا تو اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

ثاقب کے چہرے پر کس قدر معصومیت تھی۔

ہونٹوں پر اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

آنکھوں میں پاکیزہ سی چمک موجود تھی۔

ہلکے آسمانی رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔

عاصمہ نے جلدی سے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ نہ جانے وہ کون سی کشش تھی ثاقب کی نگاہوں میں کہ اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"پھر یہ بے رخی کس لئے ہے؟" ثاقب نے دبی زبان میں پوچھا۔

"آپ کو دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔" عاصمہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

"دفتر میرے لئے آپ کی بے رخی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔"

"مسٹر ثاقب!" اچانک عاصمہ کے اندر سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھی۔ "میں ہر کس و ناکس سے بلاوجہ بے تکلف ہونے کی عادی نہیں ہوں۔"

پھر اس سے پیشتر کہ ثاقب اس کی بات کا کوئی جواب دیتا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

وقت کی آندھی اور تباہیوں کا سیلاب نہ کسی کے روکے رکا ہے نہ رک سکتا ہے۔

تقدیر کا چکر ہر حالت میں پورا ہو کر رہتا ہے۔

یہی حالت عاصمہ کی بھی تھی۔ اس نے ثاقب کے سلسلے میں ماں کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ کبھی آصف کی تعلیم کا بہانہ پیش کیا اور کبھی گھر کی حالت کی آڑ لی لیکن شبانہ بیگم کو تو بس ایک ہی آرزو تھی۔

کسی طرح وہ اپنی زندگی میں عاصمہ کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ اس کی مانگ میں افشاں بھر دیں اور اس امانت کو اس کے حقدار کے سپرد کر دیں۔ جسے انہوں نے بیس سال تک اپنے سینے کی دھڑکنوں میں چھپا کر رکھا تھا۔

وقتی طور پر ان کی حالت سنبھل ضرور گئی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی یہی رائے دی تھی کہ اب انہیں صرف آرام کی ضرورت ہے۔ مرض خطرے کی حدود سے باہر نکل چکا ہے لیکن شبانہ بیگم اپنی کیفیت کو اپنے مسیحاؤں سے زیادہ بہتر طور پر محسوس کر رہی تھیں۔ وہ غم جو

ان کی زندگی سے چمٹ کر رہ گیا تھا' صرف موت کے ہاتھوں دور ہو سکتا تھا۔

ٹی بی کے جراثیم کا علاج ڈاکٹروں نے کر دیا تھا لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس درد کا کوئی درماں نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس غم کا کوئی مداوا نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک ناسور تھا جو اندر ہی اندر اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا تھا۔

شبانہ بیگم سمجھ رہی تھیں کہ ان کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ کسی بھی لمحے باد مخالف کے ایک جھونکے سے بجھ سکتا ہے۔ اسی غرض سے وہ ہر قیمت پر جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھیں۔

تقدیر کا چکر تیز رفتاری سے گھومتا رہا۔ حالات کی کروٹیں جاری رہیں۔ قسمت بدلتے ہوئے حالات پر قہقہہ زن تھی۔

آصف کا نتیجہ آیا تو ماں کی دعاؤں اور بہن کی آرزوؤں نے اسے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب کیا۔

عاصمہ کو آصف کی کامیابی پر جہاں خوشی ہوئی وہاں اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ اب ماں کی ضد پوری ہو کر رہے گی۔ اس خدشے نے اسے عجیب گومگو کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ ہونٹوں پر ہنسی بکھیرے وہ بھائی کو سینے سے لگائے اسے شاندار مستقبل کی دعائیں دے رہی تھی لیکن دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔

ماں کی خوشی کی خاطر اور آصف کا دل بڑھانے کے لئے اس نے پڑوسیوں کو چائے کی دعوت دی۔ مٹھائی منگوا کر غرباء میں اپنی حیثیت کے مطابق تقسیم کرائی۔ نسیمہ بیگم اور ثاقب نے اس مختصر سی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شبانہ بیگم کے انکار کے باوجود نسیمہ بیگم نے آصف کو ایک سوٹ کا قیمتی کپڑا دیا اور ثاقب نے ایک مردانہ گھڑی تحفہ میں دی۔

عاصمہ نے ان قیمتی تحفوں پر نظر ڈالی تو آصف کی دلجوئی کی خاطر مسکرا کر اسے مبارک باد دی' لیکن اس کے دل میں نفرت کا ایک طوفان موجزن تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ نسیمہ بیگم اور ثاقب نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔ شاید وہ ان قیمتی تحفوں کے ذریعے عاصمہ کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ شبانہ بیگم کا دل جیتنے کے خواہاں تھے' لیکن عاصمہ مرعوب ہونے کے بجائے ان کی طرف سے کچھ اور متنفر ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے

سرمایہ داری اس کی غربت کا مذاق اڑا رہی ہے۔ جیسے وہ نیلام گھر میں رکھی ہوئی کوئی ایسی بے جان شے ہے جس کی بولی دی جا رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عاصمہ کا دل اس احساس سے تڑپ اٹھا۔ ضبط پیہم کے باوجود اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ جلدی سے کسی کام کے بہانے اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ تنہائی بڑھی تو بے بسی کا احساس اور بڑھ گیا۔ وہ بے اختیار رو پڑی۔ آنسو شبنمی موتیوں کی طرح اس کے رخسار پر بہتے رہے۔ اس کی نظریں چولھے میں دبی ہوئی اس لکڑی پر مرکوز تھیں جو بجھنے کے باوجود دھواں دے رہی تھی' شاید اس کے اندر بھی کوئی چنگاری سلگ رہی تھی۔

عاصمہ کسی بت کی طرح خاموش کھڑی دھواں دیتی ہوئی لکڑی کو تکتی رہی اور آنسو بہاتی رہی پھر اس کے خیالوں کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا۔ باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے جلدی سے دوپٹہ کے آنچل میں اپنے آنسو جذب کر لئے۔

آصف بہن کو تلاش کرتا ہوا ادھر آ نکلا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا لیکن بہن کو اداس دیکھا تو یکلخت بے چین ہو کر پوچھا۔

"آپی! تم رو رہی ہو۔"

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں تو۔" عاصمہ نے مسکرانے کی کوشش کی تو کچھ اور اداس ہو کر رہ گئی۔

آصف نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپی! کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں پگلے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔"

آصف اب اتنا بچہ بھی نہ تھا کہ بہن کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی کو خوشی کی انتہا سمجھ کر ٹال جاتا۔ اس کے دل میں یہ خواہش بڑی شدت سے ابھری تھی کہ وہ بہن کے دکھ کا راز کسی طرح جان لے' لیکن اس نے ہمیشہ عاصمہ کا بے حد احترام کیا۔ اس وقت بھی وہ اصرار کی جرأت نہ کر سکا۔ دبی زبان میں پوچھا۔

"آپ کمرے سے اٹھ کر یہاں کیوں چلی آئی تھیں؟"

"وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے امی جان کے لئے یخنی جو تیار کرنی تھی۔" عاصمہ نے پھر جھوٹ بولا۔ "تم چلو میں ابھی آتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں آپی! آپ اس وقت کیوں رو رہی تھیں۔" آصف نے دبی زبان میں کہا تو عاصمہ کا دل یکلخت کانپ اٹھا۔

اس نے سوچا۔

کیا آصف اس کے غم سے واقف ہے.........

کیا وہ اس راز کی تہہ تک پہنچ گیا ہے جو عاصمہ کے دل کے گہرائیوں میں مخفی تھا.........

لیکن.........

"آصف بھلا کیسے جان سکتا ہے؟" عاصمہ نے سوچا۔ پھر آصف کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"ذرا مجھے بھی بتاؤ کہ تم کیا سمجھے ہو؟"

آصف نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ الفاظ حلق میں ہی الجھ کر رہ گئے۔ عاصمہ اس کی کیفیت پر مسکرا کر بولی۔

"پگلا کہیں کا......... کہہ تو دیا کہ یہ خوشی کے آنسو تھے۔"

"نہیں آپی!" آصف نے بے ساختہ کہا۔ "میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں جو ان بہلاووں میں آ جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیوں روئی تھیں۔ خونی رشتے اتنی آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے۔ آج ایک لمحے کے لئے مجھے بھی یہ خیال آیا تھا کہ اگر ابا جان ہوتے تو میری خوشیاں اتنی پھیکی پھیکی کبھی نہ رہتیں اور........."

"آصف!" عاصمہ تڑپ اٹھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بے اختیار آصف کو اپنے سینے لگا لیا۔

آصف کی قوتِ فکر نے اس کے دل پر ایک نیا زخم لگایا تھا لیکن اس نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"آصف میرے اچھے بھائی! بھول جاؤ ان باتوں کو' جو کچھ قسمت میں لکھا تھا وہ پورا ہو چکا۔ اب ہمیں ماضی کی تلخیوں کو یاد کر کے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں مستقبل کی فکر دامنگیر ہونی چاہئے۔"

عاصمہ بڑی دیر تک آصف کو سمجھاتی رہی۔ پھر جب آصف چلا گیا تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ دھو کر خشک کیا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی باہر آ گئی۔

خوشیوں کے کچھ لمحات جو آصف کی کامیابی کی صورت میں آئے تھے بڑی تیزی سے گزر گئے۔ امتحان کا نتیجہ آئے ابھی پندرہ دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ حالات نے عاصمہ کا مذاق اڑانے کی خاطر ایک نئی کروٹ لی۔

اس روز وہ اسکول سے واپس آ کر ماں کے پاس بیٹھی انہیں کھانا کھلا رہی تھی کہ آصف دوڑتا ہوا اندر آیا اور پھر ماں سے لپٹ کر بولا۔

"امی جان! آج میں آپ کو ایک بڑی اچھی خبر سنانے آیا ہوں۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا! کیا خبر ہے؟"

"ایسے نہیں' پہلے آپ مٹھائی منگوایئے پھر بتاؤں گا۔"

شبانہ بیگم نے آصف کے چہرے پر سچی خوشی کی چمک دیکھی تو بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"پہلے تم خبر تو سناؤ' مٹھائی جتنی چاہے کھا لینا۔"

آصف نے ماں کو پیار بھری معصوم نظروں سے دیکھا' پھر بولا۔

"امی جان! آج مجھے ملازمت مل گئی ہے۔"

"سچ........." شبانہ بیگم کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔

"ہاں امی! کل صبح سے میں اپنی اصلی زندگی کا آغاز کروں گا۔"

عاصمہ نے آصف کی ملازمت کی خبر سنی تو ایک بار پھر خوشیوں میں غم شامل ہو گیا۔

اس نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کل صبح ہی سے تم کو ملازمت پر جانا ہو گا۔"

"ہاں آپی! اور اب آپ کو ٹیوشن کی ضرورت نہیں رہے گی۔" آصف نے کہا۔

"بس ایک ماہ کی بات اور ہے' مجھے پہلی تنخواہ مل جائے تو آپ ٹیوشن چھوڑ دیجئے گا۔"

شبانہ بیگم نے پوچھا۔

"ارے لڑکے یہ تو بتا کہ ملازمت کہاں ملی ہے؟"

"نہر کے محکمے میں۔" آصف بولا۔ "ثاقب بھائی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی برانچ میں ہی رکھا ہے۔"

شبانہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

"یہ تم نے ثاقب کو انکل کہتے کہتے بھائی کہنا کب سے شروع کر دیا؟"

"خود ثاقب بھائی نے کہا تھا کہ میں انہیں انکل کے بجائے بھائی کہا کروں۔"

"خدا اس کو اس نیکی کا اجر دے۔" شبانہ بیگم نے ثاقب کے حق میں دعا دیتے ہوئے کہا۔ "بڑا نیک اور ہمدرد لڑکا ہے ورنہ آج کل کون کسی کے کام آتا ہے۔"

عاصمہ خاموش بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی' اسے آصف کی ملازمت کی خبر سن کر کوئی خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔ وہ تو یہ چاہتی تھی کہ آصف ملازمت کے بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے اپنی تعلیم کو جاری رکھے لیکن حالات نے اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہونے دی اور پھر جب آصف نے یہ بتایا کہ ثاقب نے اسے اپنی ہی برانچ میں ملازم رکھوایا ہے تو عاصمہ کو خوشی ہونے کے بجائے شدید الجھن ہوئی تھی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

آخر ثاقب نے آصف کو اپنے ہی آفس میں کیوں ملازمت دلوائی؟

پھر اپنی ہی برانچ میں کیوں رکھا.........؟

کیا اس میں بھی کوئی مصلحت تھی.........؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ ثاقب' آصف کو اپنی خواہشات کی تکمیل کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں.........؟

کیا اگر اس نے شادی سے انکار کر دیا تو آصف کی ملازمت ختم ہو جائے گی؟

اُف خدایا.........!

پروردگار.........!

"ثاقب نے کس قدر گہری چال چلی ہے۔" عاصمہ نے سوچا تو ماضی کی تلخیوں نے اس کے شبہ کو ہوا دی اور مرد کی نفرت کا جذبہ بیدار ہو کر طوفانی شکل اختیار کر گیا۔

دغاباز.........

مکار.........

فریبی.........

عاصمہ ذہنی طور پر تلملا کر رہ گئی۔ اس نے آصف کی طرف دیکھا جو ہنس ہنس کر ماں کو اپنی ملازمت کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"امی جان! آج کل تو بی اے اور ایم اے پاس کو بھی اتنی اچھی ملازمت نہیں ملتی۔ صبح آٹھ سے دو بجے تک کا دفتر ہو گا۔ اس کے بعد میں شام کے کسی کالج میں داخلہ لے کر

پڑھائی بھی جاری رکھوں گا۔"

شبانہ بیگم نے جھولی پھیلا کر ثاقب کو دعا دینی شروع کر دی تو عاصمہ نے پوچھا۔

"تنخواہ کیا ملے گی؟"

"ابھی کچھ طے نہیں ہوا آپی! لیکن ثاقب بھائی کہہ رہے تھے' ڈھائی سو سے اسٹارٹ ملے گا۔ آگے چل کر ترقی کے امکانات بھی ہیں۔"

عاصمہ کچھ سوچ کر چپ ہو گئی تو آصف نے کہا۔ "آپی! کیا آپ میری ملازمت سے خوش نہیں ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" عاصمہ جلدی سے بولی۔ "میں صرف یہ چاہتی تھی کہ تم بی اے کر لو اس کے بعد ملازمت کرو۔"

"آپ فکر نہ کریں' میں ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھتا بھی رہوں گا۔"

شبانہ بیگم نے عاصمہ سے پوچھا۔

"بٹی! میرا خیال ہے کہ سیر بھر مٹھائی کا ایک ڈبہ منگوا کر نسیمہ بیگم کے یہاں بھجوا دیا جائے۔ اس طرح ہم اپنے شکریہ کا اظہار بھی کر سکتے ہیں اور نسیمہ بیگم کو بھی بہت خوشی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" عاصمہ نے ماں کی خوشی کے احترام کی خاطر کہا پھر اٹھ کر الماری سے پیسے نکال کر آصف کو دیئے اس کے بعد گھر کے کام کاج میں الجھ گئی۔

شام کو جب وہ ٹیوشن سے لوٹی تو نہ جانے کیوں اس کا دل بار بار دھڑک رہا تھا۔ تھکے تھکے قدم اٹھاتی وہ گھر میں داخل ہوئی۔ شبانہ بیگم کے کمرے کے قریب پہنچی تو اس کے قدم دہلیز پر ہی رک گئے۔

اندر سے نسیمہ بیگم کی آواز آ رہی تھی۔

"خدا نے میری دعائیں سن لیں بہن! آصف پاس بھی ہو گیا اور خدا کا کرم ہے کہ اسے اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ اب میں کوئی حیلہ بہانہ نہ سنوں گی۔"

نسیمہ بیگم کے یہ الفاظ عاصمہ کے دل پر نشتر بن کر چبھے تھے۔ اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے لہرا گئے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

اندر اس کے مستقبل کا سودا ہو رہا تھا.........

ایک احسان کے بدلے ایک زندگی خریدی جا رہی تھی............

اور .... اور ....

عاصمہ یہ سب کچھ سننے پر مجبور تھی' پھر ماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں نے تم سے انکار کب کیا ہے بہن خدا تمہیں تمہاری خوشیاں مبارک کرے۔ عاصمہ جیسی میری بچی ہے ویسی تمہاری بھی ہے۔ جب چاہو اسے بیاہ کر لے جاؤ .... لیکن............"

"اب لیکن ویکن کو چھوڑو بہن! نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔" نسیمہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"دیر کی بات نہیں ہے' مگر کچھ تیاری تو کرنی ہی ہو گی۔" شبانہ بیگم بولیں۔ "خدا کے فضل سے آصف بھی ملازم ہو گیا ہے اس لئے دو چار چیزیں تو بڑی آسانی سے بن سکتی ہیں۔"

"مجھے کسی چیز کی لالچ نہیں ہے بہن! نیک کام میں دیر نہیں کرنا چاہئے۔" نسیمہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے تو صرف عاصمہ چاہئے۔"

"یہ تمہاری محبت ہے جو عاصمہ کو اس قابل سمجھتی ہو' ورنہ کہاں عاصمہ اور کہاں ثاقب.........."

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔" نسیمہ بیگم جلدی سے بولیں۔ "ورنہ خدا گواہ ہے کہ میں نے عاصمہ کو کبھی ثاقب سے کم نہیں سمجھا' پھر حالات کبھی یکساں بھی نہیں رہتے۔ خدا نے اگر آج تمہارا وقت بگاڑا ہے تو کل وہی بنانے والا بھی ہے۔"

شبانہ بیگم نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"میں ہر طرح سے تیار ہوں' لیکن ایک بات اگر تم میری مان لو تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"کہو' اگر ماننے والی ہوئی تو ضرور مان لوں گی۔"

"آصف کو کم از کم پہلی تنخواہ مل جانے دو' اس کے بعد تم جس طرح کہو گی میں ویسا ہی کروں گی۔"

"اگر یہ تمہاری خوشی ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے لیکن مفت میں دنیا دکھاوے کے

لئے زیر بار ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"زیر باری کاہے کی بہن!" شبانہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہماری جو کچھ حالت ہے وہ دنیا سے ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن کم از کم دولہا کے کپڑے کے پیسے تو دینے ہی ہوں گے۔"

"کیسی غیریت کی بات کرتی ہو۔" نسیمہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ "ثاقب تمہارا ہی بچہ ہے۔ جب بھی تمہارے حالات سازگار ہوں جی بھر کر اپنے دل کے ارمان پورے کر لینا۔ میں تو صرف اس لئے منع کر رہی تھی کہ تم کو مفت کی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے .... لیکن میں تم سے ایک مہینے کی مہلت ضرور مانگوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" نسیمہ بیگم نے اقرار کر لیا پھر بولیں۔ "جہاں اتنے دنوں انتظار کیا ہے وہاں ایک مہینہ اور سہی' لیکن اس کے بعد میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ عاصمہ اب میری ہو چکی ہے۔"

"وہ پہلے بھی تمہاری ہی تھی بہن!"

ماں کے الفاظ عاصمہ کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتے چلے گئے۔ جو کچھ اس نے سنا تھا وہی کافی تھا اس سے آگے سننے کی تاب نہیں تھی اس میں۔ اس لئے وہ خود کو سنبھالتی لڑکھڑاتے قدموں سے دوسرے کمرے میں آ گئی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔

اپنی مجبوریوں پر کڑھتی رہی ....

اپنی بے بسی پر تڑپتی رہی ....

اور پھر جب اس نے نسیمہ بیگم کے جانے کی آواز سنی تو آنسو پونچھتی اٹھی۔ کسی ٹھہرے ہوئے طوفان کی طرح قدم اٹھاتی ماں کے کمرے میں گئی تو ماں کے چہرے پر دمکنے والی خوشیاں دیکھ کر اس کے حوصلوں پر اوس پڑ گئی۔

"عاصمہ بیٹی! آج تم نے بڑی دیر کر دی۔" شبانہ بیگم نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "نسیمہ بیگم تمہاری راہ تک تک کر ابھی گئی ہیں۔"

"بچوں کو پڑھانے میں کچھ دیر ہو گئی۔" عاصمہ نے مضمحل انداز میں کہا۔ پھر ماں کے قریب سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے، تم چپ چپ سی کیوں ہو؟"

"یوں ہی، سر میں درد ہو رہا ہے۔" عاصمہ نے دل کی گہرائیوں سے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"منہ ہاتھ دھو کر گرم گرم چائے پی لو، طبیعت سنبھل جائے گی۔"

عاصمہ نے جواب میں ماں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ پلکوں کے پیچھے مچلنے والے آنسو ابھر کر سامنے آ گئے تو وہ تڑپ کر ماں سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔

ماں ہی تو ایک آخری سہارا تھی جو اس کی پشت پناہی کر سکتی تھی۔

شبانہ بیگم نے بیٹی کو یوں بلک بلک کر روتے دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے عاصمہ! کیوں رو رہی ہو میری لاڈلی؟"

"امی جان..........!" عاصمہ رندھی آواز میں سسک اٹھی۔

"خدا کے لئے بیٹی کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے، کیا کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟"

"نہیں.........."

"پھر رو کیوں رہی ہو؟" شبانہ بیگم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"امی جان! .... میں........." عاصمہ نے دوبارہ ہمت کر کے کہنا چاہا لیکن مدعا زبان تک نہ لا سکی۔

"کیوں رو رو کر خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ کچھ کہو تو سہی، بات کیا ہے؟"

عاصمہ نے بمشکل ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔ "امی جان! میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟" شبانہ بیگم نے بڑے لاڈ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ثاقب تم کو پسند نہیں ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے .... لیکن میں شادی نہیں کروں گی۔" عاصمہ نے ڈبڈبائی نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیوانی........." شبانہ بیگم مسکرا کر بولیں۔ "کیا تمام عمر یوں ہی بیٹھی رہو گی۔"

"امی جان!" عاصمہ کا دل بھر آیا۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا، میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کیا بات ہو گی؟"

"خدا کے لئے امی جان! مجھے اپنے پاس رہنے دیجئے، مجھے اپنے قدموں سے دور مت کیجئے .... نہیں تو میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔" عاصمہ نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے، کیوں بری فال نکالتی ہو منہ سے؟" شبانہ بیگم پیار سے بولیں۔

"تمہیں تو خوشی ہونی چاہئے کہ ایک اچھے گھرانے کی زینت بن کر رہو گی۔ پھر یہ کہ ثاقب اپنا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ نیک ہے، سعادت مند ہے، دولت مند ہونے کے باوجود غرور تو نام کو بھی نہیں ہے۔ ایسے رشتے تو صرف قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو ڈالو۔"

"امی جان!" عاصمہ نے بڑی امیدوں سے کہا۔ "میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیجئے۔"

"کیوں دیوانوں جیسی باتیں کر رہی ہو عاصمہ۔" شبانہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے راجاؤں کو بھی ایک دن اپنی لڑکیاں بیاہنی پڑتی ہیں اور پھر میں نسیمہ بیگم سے وعدہ بھی کر چکی ہوں۔ خدا نے چاہا تو ایک ماہ بعد تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی۔ تمہیں نئی زندگی کی خوشیاں نصیب ہوں گی تو مجھے دعائیں دو گی۔"

"امی جان!" عاصمہ نے پوری قوت سے ماں کو لپٹا لیا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اے لڑکی تُو تو سچ مچ دیوانی ہو گئی۔" شبانہ بیگم نے پیار سے عاصمہ کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اسے سمجھانے لگیں۔

وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ عام لڑکیوں کی طرح شاید عاصمہ بھی اپنے گھر اور اپنوں سے جدائی کے تصور سے پریشان ہو رہی ہے۔

لیکن ....

عاصمہ کے دل کی گہرائیوں میں جو طوفان مچل رہا تھا انہیں اس کی مطلق خبر نہ تھی۔

☆======☆======☆

عاصمہ کی کیفیت اس سمندر کی سی تھی جس کی سطح اوپر سے بڑی پُرسکون نظر آتی ہے لیکن جس کی تہوں میں ہزاروں طوفان اور سیلاب مچلتے رہتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں نے اس کی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے۔

ماں کی خاطر اس نے دل میں تڑپنے والے اس جذبے کو تھپک تھپک کر سلا دیا جو

مرد کی نفرت سے لبریز تھا۔

بھائی کے مستقبل کی وجہ سے اس نے اپنے ہونٹ سی لئے تھے............

گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی............

اور............

ایک طرف ماں کو سکون آ گیا تھا............

دوسری طرف بھائی کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی............

لیکن............

عاصمہ کے دل میں ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا جس کی خبر کسی کو نہ تھی۔

وقت کی رفتار تیز ہو گئی۔ ایک مہینہ یوں بیت گیا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو اور پھر آصف جب پہلی تاریخ کو دفتر سے گھر آیا تو اس کے ہونٹوں پر روح کی گہرائیوں سے پیدا ہونے والی خوشی رقصاں تھی۔ وہ سیدھا ماں کے پاس گیا۔ ماں کے قدموں کو چوما' پھر جیب سے تنخواہ نکال کر ان کے ہاتھوں میں دے دی۔

شبانہ بیگم کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ خوشی کے انمول خزینے آنسوؤں کی صورت میں ان کی ممتا بھری آنکھوں میں چھلک آئے۔ آصف کو سینے سے لگا کر بولیں۔

"خدا تم کو زندگی کی ایسی لاکھوں خوشیاں دیکھنی میسر کرے
جگ جگ جیو اور پھلو پھولو۔"

آصف نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"امی جان! یہ سب آپ کی دعاؤں اور ثاقب بھائی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"

"نہیں بیٹے! یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔"

شبانہ بیگم نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پلنگ پر بکھرے ہوئے نوٹوں کو گنا' پھر آصف کی طرف دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو صرف دو سو بیس روپے ہیں آصف!"

"ہاں امی جان!" آصف مسکرا کر بولا۔ "میں نے تیس روپے آپ کی اجازت کے بغیر خرچ کئے ہیں۔"

"اپنے لئے کوئی چیز لی ہے؟"

"جی نہیں۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔ پھر جیب سے ایک پیکٹ نکال کر ماں کی

طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کے لئے اپنی پسند کی چوڑیاں لایا ہوں۔"

شبانہ بیگم نے پیکٹ کھول کر دیکھا تو اس میں رولڈ گولڈ کی چھ عدد سنہری چوڑیاں جھلملا رہی تھیں۔ ان کا دل فرطِ مسرت سے بھر آیا۔ پھر ماضی کے کچھ گزرے ہوئے حسین لمحات بھی یاد آ گئے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک سرد آہ بھری اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سینے میں رستے ہوئے ناسوروں کو آج پھر ٹھیس پہنچی تھی۔ انہیں وہ دن یاد آ گئے۔ جب شیخ عارف علی نے سہاگ رات کو انہیں ایسی ہی چھ عدد سونے کی چوڑیاں دی تھیں۔

لیکن............

وہ سب کچھ ایک خواب تھا............

کچھ عرصے کے لئے پلکوں پر ابھرا پھر تاریکی میں ڈوب گیا............

سہاگ رات کا وہ طلائی تحفہ بھی تو اب ان کے پاس نہ رہا تھا۔ کب کا بِک چکا تھا............

اور............

آج جب آصف نے اپنی تنخواہ کی خوشی میں ان کو ویسی ہی چوڑیاں دیں تو ان کے دل کے زخم پھر ہرے ہو گئے۔

آصف نے ماں کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت دیکھی تو پوچھا۔

"امی جان! کیا میرا تحفہ آپ کو پسند نہیں آیا۔"

"نہیں............ نہیں تو............" شبانہ بیگم کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ماضی کے حسین خواب ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ حال کے تقاضوں کا خیال ابھرا تو انہوں نے آصف کو دعا دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارا یہ تحفہ بے حد پسند آیا۔ خدا تم کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے' لیکن اتنی مہنگی چوڑیاں لینے کی کیا ضرورت تھی؟ تیس روپے تمہارے کپڑوں کے کام آ سکتے تھے۔"

آصف نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

"امی جان! یہ چوڑیاں تیس روپے کی کب ہیں............ صرف دس روپوں کی ملی ہیں۔"

"باقی بیس کا کیا لیا ہے؟"

"آپی کا تحفہ۔" آصف نے جواب دیا پھر ماں کی دعائیں لیتا ہوا باہر آ گیا۔

عاصمہ باورچی خانے میں بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ آصف دبے قدموں بہن کے قریب آ گیا۔ پھر اچانک زور سے کہا۔

"آپی!"

اور عاصمہ یکلخت چونک اٹھی۔

"ڈر گئیں آپی!" وہ ہنس پڑا۔

"کب آئے دفتر سے؟" عاصمہ نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ابھی تو آیا ہوں۔"

"جاؤ کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو ڈالو' میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

آصف نے جواب دینے کے بجائے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا سنہری پیکٹ نکالا۔ پھر بڑی عقیدت سے بہن کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا ہے اس میں؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"خود ہی کھول کر دیکھ لیجئے۔"

عاصمہ نے پیکٹ کھولا تو اس میں موتیوں کے خوبصورت آویزے جھول رہے تھے۔ موتی ہرچند کہ سچے نہ تھے لیکن ایک بھائی کی محبت نے جو چمک دمک ان میں پیدا کر دی تھی وہ سچے موتیوں سے کہیں زیادہ تھی۔

"یہ کہاں سے اٹھا لائے!" عاصمہ نے تعجب سے پوچھا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ آج پہلی تاریخ ہے حالانکہ آج ہی اسے اپنی تنخواہ بھی ملی تھی۔ ٹیوشن کے پیسے بھی ملے تھے۔

"سڑک پر پڑے تھے .... میں نے اٹھا کر دیکھا .... اچھے لگے تو آپ کے لئے لے آیا۔" آصف نے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ' یہ تمہیں کہاں سے مل گئے؟" عاصمہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے آپی کہ آج آپ کو اسکول سے تنخواہ نہیں ملی شاید؟"

"اوہ........." عاصمہ نے مسکرا کر کہا۔ "گویا آصف صاحب بہادر اپنی آپی کے لئے پہلی تنخواہ کا تحفہ لائے ہیں .... کیوں؟"

"پہلے یہ بتایئے کہ کیسے ہیں' یہ بُندے۔" آصف نے پوچھا۔

"بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں۔" عاصمہ بولی۔ پھر آصف کو خوش کرنے

کے لئے اس نے آویزوں کو پیکٹ سے نکال کر کانوں میں ڈال لیا۔

"اب تو آپ سچ مچ دلہن لگ رہی ہیں۔" آصف نے شوخی سے کہا۔

"آصف.........!" عاصمہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "بہت شریر ہوتے جا رہے ہو تم۔"

"اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔" آصف جلدی سے بولا تو عاصمہ نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"خدا تمہیں پہلی تنخواہ مبارک کرے۔ زندگی میں ایسی ایسی ہزاروں خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں۔"

"بس آپی! صرف ہزاروں .... امی جان نے تو لاکھوں کی دعائیں دی تھیں۔"

عاصمہ بے اختیار بھائی کی بات پر مسکرا دی۔ پھر آصف چلا گیا تو اس نے جلدی جلدی چائے تیار کی اور ٹرے اٹھائے ہوئے ماں کے کمرے میں آ گئی جہاں آصف بھی کپڑے تبدیل کئے ہوئے بیٹھا تھا۔

چائے کے دوران کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر آصف نے بہن کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپی! اب کل سے آپ ٹیوشن پر جانا چھوڑ دیں۔"

"میرا بھی یہی مشورہ ہے بیٹی!" شبانہ بیگم جلدی سے بولیں۔ "زیادہ محنت کرنے سے تمہاری صحت بھی خراب ہوتی جا رہی ہے اور اب تو خدا کے فضل و کرم سے آصف بھی کمانے لگا ہے۔"

"آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر امی جان! لیکن میری خوشی ہے کہ ابھی ٹیوشن نہ چھوڑوں۔ اس لئے کہ ابھی مجھے آصف کو آگے بھی تعلیم دلوانی ہے۔" عاصمہ نے دبی زبان میں کہا۔ وہ اپنی مصروفیات میں کمی نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔

"آپ میری فکر بالکل نہ کریں آپی!" آصف نے کہا۔ "میں گھر کے اخراجات کے علاوہ اپنی پڑھائی کے اخراجات بھی سنبھال سکتا ہوں۔"

عاصمہ نے آصف کی طرف دیکھا پھر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"تم ابھی بچے ہو آصف! میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ زیادہ مناسب ہے۔"

"آپ کے سامنے تو میں ہمیشہ بچہ ہی رہوں گا۔" آصف نے بہن کو پیار سے

گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ اگلے مہینے سے مجھے ڈھائی سو کے بجائے پورے تین سو ملا کریں گے۔ ثاقب بھائی کی کوششوں سے مزید پچاس روپے کی ترقی مل گئی ہے جس سے میں اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کرلوں گا۔"

عاصمہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شبانہ بیگم جلدی سے بولیں۔

"ثاقب ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر پیدا ہوا ہے۔ خدا اسے ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔"

"آمین!" آصف بولا۔

عاصمہ نے ثاقب کا نام سنا تو ہونٹ چبا کر گردن جھکا لی۔ اس کے خیالوں میں پھر ہیجانی اُبال آگیا۔ وہ سوچنے لگی..........

ثاقب کی مہربانیوں کے پیچھے اس کی خودغرضی بھی شامل ہے۔

وہ شبانہ بیگم کا دل جیتنے کی خاطر سنہری جال بچھا رہا ہے..........

دغاباز..........

فریبی..........

عورتوں کی مجبوریوں کو دولت سے خریدنا چاہتا ہے..........

آخر مرد جو ہے..........

لیکن..........

"میں آخری دم تک اس سے نفرت کرتی رہوں گی۔" عاصمہ نے سوچا اور اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دینے لگی۔

"چپ کیوں ہو گئیں آپی۔" آصف نے پوچھا تو وہ چونک کر بولی..........

"کچھ نہیں، میں سوچ رہی تھی کہیں ملازمت تمہاری تعلیم میں حارج نہ ہو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا لیکن آپ ٹیوشن چھوڑ دیں۔"

"اچھا۔" عاصمہ کے لہجے میں طوفان پوشیدہ تھا۔

"آپی! آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت باہر سے نسیمہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"آصف میاں! کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

آصف اٹھ کر تیزی سے باہر گیا، پھر نسیمہ بیگم کو لئے اندر آ گیا۔ عاصمہ نے اٹھ کر

انہیں سلام کیا پھر گردن جھکا کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"خدا سلامت رکھے، بڑی نیک لڑکی ہے۔" نسیمہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر شبانہ بیگم کے پاس پڑی بید کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

آصف تھوڑی دیر تک بیٹھا نسیمہ بیگم سے باتیں کرتا رہا۔ پھر چائے کا سامان لانے کی خاطر چلا گیا تو نسیمہ بیگم نے شبانہ بیگم سے کہا۔

"مبارک ہو بہن آج آصف میاں کو پہلی تنخواہ ملی ہے۔ تمہارا ارمان بھی پورا ہو گیا۔"

شبانہ بیگم بولیں۔

"یہ سب اللہ کا کرم اور آپ لوگوں کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔"

"مہربانی کی اس میں کیا بات ہے۔ ثاقب تو دس غیروں کو ملازمت دلوا چکا ہے۔ آصف تو گھر کا بچہ ہے۔"

"پھر بھی آج کل بھلا کون کسی کے کام آتا ہے۔"

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں بہن!" نسیمہ بیگم بولیں۔ "دنیا میں ابھی ایسے لوگ بھی زندہ ہیں جو دوسروں کی تکلیف کو اپنا درد سمجھ کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا کاروبار کیسے چلے؟"

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" شبانہ بیگم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "جب اپنے غیر بن جائیں تو ہمیشہ پرائے کام آتے ہیں۔"

"خوشی کے موقع پر غم کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" نسیمہ بیگم نے شبانہ بیگم کو ملول ہوتے دیکھا تو بولیں۔ "خدا جو کچھ کرتا ہے انسان کی اس میں کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور ہوتی ہے۔ پھر پرانی باتوں کو یاد کر کے مفت میں خون جلانے سے کیا حاصل .... جو کچھ ہو چکا ہے اسے اب بھول جاؤ۔"

"خون کے رشتے اتنی آسانی سے بھلا کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔" شبانہ بیگم نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"ارے، یہ آصف میاں کہاں چلے گئے؟ میں تو آج ان سے مٹھائی کھانے آئی تھی۔" نسیمہ بیگم نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ مٹھائی لینے ہی گیا ہو گا۔"

"آج میں تم سے بھی کچھ مانگنے آئی ہوں۔" نسیمہ بیگم نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ "یاد ہے بہن! تم نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

شبانہ بیگم کو نسیمہ بیگم کی بات پر ہنسی آ گئی۔

"ہنسی میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو بہن! آج تو میں سب کچھ طے کر کے ہی یہاں سے ٹلوں گی۔" نسیمہ بیگم کرسی پر پہلو بدل کر بولیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہو نسیمہ بہن! بھلا میں اور تم کو ٹالنے کی کوشش کروں گی۔"

"پھر بتاؤ کب پورا کر رہی ہو اپنا وعدہ۔"

"وعدہ پورا کرنے کی بھی ایک ہی کہی تم نے۔" شبانہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا۔ "عاصمہ جیسی میری بیٹی ہے ویسی تمہاری بھی ہے۔ جب چاہے اسے لے جاؤ۔"

نسیمہ بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

"اسی مہینے کی بیس تاریخ کو ثاقب کی سالگرہ ہے۔ چاند کی بھی گیارہ تاریخ ہو گی۔ میں چاہتی ہوں نکاح کی رسم بھی اسی روز ہو جائے۔ ثاقب کی سالگرہ کی خوشی میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

"ابھی تو میں نے کچھ انتظام بھی نہیں کیا۔ آج ہی تو آصف کو تنخواہ ملی ہے۔" شبانہ بیگم نے رسمی طور پر کہا۔ ورنہ دل میں وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ عاصمہ جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

"نہ بہن! .... اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔" نسیمہ بیگم بولیں۔ "تم نے وعدہ کیا تھا کہ آصف کو پہلی تنخواہ مل جائے تو جیسا میں چاہوں گی ویسا ہی ہو گا۔"

"میں انکار کب کر رہی ہوں لیکن کچھ مہلت اور دے دو تو مجھے انتظام کرنے میں ذرا آسانی ہو جائے گی۔"

"تمہیں جو کچھ انتظام کرنا ہے پندرہ بیس دن میں کر لو' میری خوشی ہے کہ چاند کی گیارہ تاریخ کو نکاح اور رخصتی کی رسم ادا ہو جائے۔"

"اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

نسیمہ بیگم کی باچھیں کھل گئیں۔ آصف واپس آیا تو انہوں نے اسے بلا کر مٹھائی منگوائی اور اسی وقت شکرانہ کی نماز ادا کر کے کے نیاز دی اور مٹھائی پڑوسیوں میں تقسیم کرا دی۔

شبانہ بیگم کی خوشیوں کی بھی کوئی انتہا نہ تھی' خدا نے آج ان کی دلی آرزو پوری کی تھی۔ اس لئے وہ جتنی بھی خوش ہوتیں کم تھا۔ آصف کو بہن کی بات پکی ہونے کا علم ہوا تو اسے بھی دلی مسرت ہوئی۔ اس لئے بھی کہ اب اس کی بہن اپنے گھربار کی ہو جائے گی اور' اس لئے کہ ثاقب سے ان کا رشتہ اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔ نسیمہ بیگم کی منگوائی ہوئی مٹھائی سے ایک لڈو اٹھا کر وہ ہنستا ہوا بہن کے پاس گیا جو اپنے خیالوں میں غرق تھی۔

آصف بڑی آہستگی سے چلتا ہوا عاصمہ کے قریب پہنچا۔ پھر اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ عاصمہ چونک اٹھی۔

"آصف! کیا بے ہودگی ہے یہ؟" عاصمہ جھلا کر بولی۔ اسے معلوم تھا کہ نسیمہ بیگم آج کیوں آئی ہیں۔ اس لئے ویسے ہی اس کا دماغ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ آصف کی شرارت نے اسے اور بھی ہوا دی۔

"آپی! ایک خوشخبری سناؤں تمہیں؟" آصف نے مسکرا کر پوچھا۔ لڈو والا ہاتھ اس نے پیچھے چھپا رکھا تھا۔

"پریشان مت کرو مجھے۔" عاصمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں اس وقت۔"

"کیا خوشخبری بھی نہیں سنیں گی؟"

"نہیں جاؤ .... مجھے تنگ مت کرو۔"

"اچھا آپی' یہی بتا دو کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟" آصف نے بہن کی جھلاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ۔"

"بوجھنے کی کوشش کیجئے۔"

"آصف.........!" عاصمہ نے قدرے غصے سے کہا۔ "کیا تم نہیں مانو گے؟"

"مان جاؤں گا' لیکن ایک شرط پر۔" آصف بولا۔ "آپ ایک منٹ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیجئے۔"

"کیوں.........؟"

"میری خوشی کی خاطر۔"

"آصف .... میں.........."

"آپی! آپ کو میری قسم۔" آصف نے بہن کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا تو عاصمہ غصے کے باوجود انکار نہ کر سکی۔

"یہ لو۔" عاصمہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"منہ کھولئے۔" آصف بولا۔

"تم باز نہیں آؤ گے اپنی شرارت سے۔" عاصمہ نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"میری قسم آپی! آپ بس ایک سیکنڈ کے لئے منہ کھولئے پھر میں چلا جاؤں گا۔" آصف نے اپنی قسم دے دی تھی۔

عاصمہ نے غصے سے ہونٹ چبائے' لیکن بھائی کی قسم مانع تھی۔ اس لئے منہ کھول دیا۔ آصف نے جلدی سے ہاتھ میں دبا ہوا لڈو بہن کے منہ میں ڈالا پھر ہنس کر یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ

"شادی کی تاریخ مبارک ہو آپی!"

اور ....

عاصمہ نے جیسے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ آصف کے الفاظ اس کے کان میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح داخل ہوئے اور دل کی گہرائیوں تک اترتے چلے گئے۔ اس نے جلدی سے لڈو کو منہ سے نکال کر باہر پھینک دیا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی کے بادل منڈلاتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہا اسی وقت ماں کے کمرے جا کر نسیمہ بیگم سے پوچھے۔

آخر آپ کو ایک مجبور لڑکی کی خوشیوں کو پامال کرنے کا کیا حق ہے............

کیوں دولت کے زعم پر کسی کی بے کسی کا سودا کیا جا رہا ہے............

کسی کی بدنصیبی کا مذاق اڑانے سے کیا حاصل ہو گا............؟

مجبوریاں کیوں خریدی جا رہی ہیں............

کیوں............؟

آخر کیوں............؟

لیکن عاصمہ ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ اسے ماں کی خوشیوں کا احترام کرنا لازم تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا انکار سن کر ماں کو صدمہ نہ پہنچے اور وہ دوبارہ بیمار پڑ جائیں۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں اس کا جواب آصف کے روشن مستقبل پر خزاں کے منحوس موسم

کی طرح حاوی نہ آ جائے۔

کتنی مجبور ہو کر رہ گئی تھی وہ............

حالات نے اسے کس قدر بے بس کر دیا تھا اور............

اپنی بے بسی اور مجبوریوں کے احساس پر اسے رونا آ گیا۔ صرف آنسو ہی تو تھے جن پر اس کو اختیار تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا منہ چھپایا۔ پھر دوڑتی ہوئی پلنگ تک آئی اور اس پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سسکتی رہی............

بلکتی رہی............

خدا سے اپنی موت کی دعائیں مانگتی رہی............

اپنی بے بسی پر ماتم کرتی رہی............

اپنی مجبوریوں پر آنسو بہاتی رہی............

اور............ اور............

دوسرے کمرے میں نسیمہ بیگم' شبانہ بیگم کے ساتھ سر جوڑے بیٹھی شادی کا پروگرام بنا رہی تھیں۔

☆======☆======☆

شیخ عارف علی نے دولت کی بنیادوں پر اپنی خوشیوں کا محل کھڑا کرنے کا جو حسین خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بادِ مخالف کے ایک ہی جھٹکے سے مسمار ہو کر رہ گیا۔

کہتے ہیں کہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور ملمع کی ہوئی چیزیں کبھی اصل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

عارف علی نے بھی دولت کے نشے میں چُور ہو کر ناہید کی جوانی خریدنے کی کوشش کی تھی۔ چڑھتے سورج کی طرح اس کی پوجا کی تھی۔ اس کے سامنے دولت کے انبار لگا دیئے تھے۔ اس کو پا لینے کی خواہش نے انہیں اس حد تک اندھا کر دیا تھا کہ وہ شبانہ بیگم کی وفا اور ننھی عاصمہ دونوں کو بھلا بیٹھے۔ اس وقت بھی ان کا دل نہ پسیجا جب شبانہ بیگم نے ان کی دہلیز سے قدم باہر نکالا تھا۔

معصوم عاصمہ کی آنکھوں میں چمکنے والی معصوم آرزوؤں کا خیال بھی ان کے پتھر دل

کو موم نہ کر سکا۔

وہ ناہید کو بڑے ارمانوں اور چاؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ دنیا کی ساری خوشیاں اور مسرتیں سمیٹ کر اس کے قدموں میں ڈال دی تھیں اور ناہید کی گھنیری زلفوں میں الجھ کر رہ گئے تھے‘ لیکن محبت کا نشہ تلخی کی آمیزش سے ایک ہی بار میں اپنا سارا سرور کھو بیٹھا۔ ظاہری چمک دمک اور جھوٹی وفا کا پردہ جب چاک ہوا تو عارف علی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہیں ناہید سے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ ان کی وفاؤں اور ان کی محبت کو اس طرح حقارت سے فراموش کر دے گی۔ زندگی کے بارہ سال کتنے اچھے گزرے تھے۔ ناہید نے اس عرصے میں اپنی محبت کے حسین جال میں کچھ اس طرح انہیں پھانس رکھا تھا کہ عارف علی کو کبھی سوچنے سمجھنے کی فرصت ہی نہ مل سکی‘ لیکن جس روز ناہید نے قصرِ شبانہ کی تختی اتروا کر قصرِ ناہید کی پلیٹ لگوائی اس روز انہیں پہلی بار اس بات کا احساس ہوا تھا کہ انہوں نے ناہید سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ پھر جب ناہید نے ان کے ساتھ تلخ کلامی اور ان کا حکم ماننے سے کھلے الفاظ میں انکار کر دیا تو آصف علی کی آنکھوں پر پڑی ہوئی تمام پٹیاں ایک ہی جھٹکے میں کھل گئیں۔ انہیں اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ جس کو ہیرا سمجھ رہے تھے وہ پتھر کا ایک حقیر ٹکڑا نکلا اور جو ہیرا تھا اسے انہوں نے پتھر سمجھ کر اپنی زندگی سے دُور کر رکھا تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ جب ان کے ڈاکٹر نے اس راز کا انکشاف کیا کہ ناہید نے اس کوکھ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا‘ جہاں ممتا کے چراغ جلتے ہیں تو وہ سر تھام کر رہ گئے۔ ناہید کی آزادی اور گھومنے پھرنے کا مطلب سمجھ میں آیا تو تلملا کر رہ گئے‘ لیکن ان کی یہ حالت اس پرندے سے مختلف نہیں تھی جو سنہری پنجرے میں قید کر دیا جائے اور آزادی کی تمنا میں پھڑپھڑا کر دم توڑ دے۔

عارف علی اگر چاہتے تو ناہید کو طلاق دے کر اور مہر کی رقم ادا کر کے گلوخلاصی کر سکتے تھے‘ لیکن ڈر اس بات کا تھا کہ دنیا ان کا مذاق اڑائے گی۔ اس بات کے طعنے دے گی کہ جوان بیوی کو رکھ نہ سکے اور پھر سب سے زیادہ انہیں اس بات کا خیال تھا کہ اگر یہ خبر شبانہ بیگم کے کانوں تک پہنچی تو ان کے دُکھے ہوئے دل کو اور صدمہ ہو گا۔

کئی دن تک وہ اپنی سوچوں میں گم رہے پھر انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ شبانہ بیگم

سے مل کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں اور انہیں دوبارہ گھر واپس لے آئیں اس طرح وہ اپنی اس غلطی کا ازالہ بھی کر سکتے تھے جو ناہید کی شکل میں ان سے سرزد ہو چکی تھی۔

تین چار روز بعد انہوں نے بڑی مشکلوں سے شبانہ بیگم کا پتہ معلوم کیا تھا۔ بڑی حسرتوں اور آرزوؤں کو سینے میں دبائے وہاں تک پہنچے تھے‘ لیکن عاصمہ کی زہر میں بھری گفتگو نے ان کے دل کو ریزہ ریزہ کر ڈالا اور وہ بیوی سے ملے بغیر ہی سر جھکائے واپس لَوٹ آئے۔ باپ ہو کر بھی اولاد سے آنکھیں چار نہ کر سکے‘ اور کرتے بھی کیسے جب کہ انہی کی غلطیوں نے بیوی اور بچوں کو در بدر کر دیا تھا۔ وہ کس منہ سے ان لوگوں پر اپنا حق جما سکتے تھے۔ جب کہ بارہ سال کے طویل عرصے میں انہوں نے کبھی پلٹ کر ان کی خبر تک نہ پوچھی تھی۔ کبھی ایک کوڑی سے بھی ان کی مدد نہ کی تھی۔

پے در پے ناکامیوں اور ذہنی جھٹکوں نے ان کی صحت پر بھی بڑا اثر ڈالا۔ کچھ روز تک بیمار رہے پھر جب صحت یاب ہو کر اٹھے تو انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اب انہیں ناہید کی آزادی سے کوئی شکایت تھی نہ اپنی بدنصیبی سے کوئی شکوہ تھا۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی وہ اور ناہید الگ الگ زندگی گزار رہے تھے۔

ان کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا.........

ان کی راہیں علیحدہ ہو گئی تھیں.........

صرف میاں بیوی کا رشتہ تھا جو بدستور اور برائے نام قائم تھا.........

ناہید کی طرف سے چشم پوشی کرنے کی غرض سے عارف علی نے خود کو پہلے سے زیادہ مصروف کر لیا۔ صبح وہ اس وقت گھر سے نکل جاتے جب ناہید اپنے نرم گرم بستر پر پڑی سو رہی ہوتی اور رات گئے واپس لَوٹتے۔

زندگی اپنے محور پر گھومتی رہی۔ وقت گزرتا رہا‘ لیکن فلک کج رفتار کی گردش نہ کبھی یکساں رہی ہے نہ رہے گی۔ بہار کے بعد خزاں اور دن کے بعد رات کا آنا ضروری ہے۔ پھر بھلا شیخ عارف علی قانونِ قدرت سے پہلوتہی کس طرح کر سکتے تھے۔

ایک روز رات گئے جب وہ تھکے ہارے گھر لَوٹے تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ قصرِ ناہید آج برقی قمقموں سے جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ بڑے ہال سے گانے بجانے اور کھنکتے ہوئے قہقہے ابھر رہے تھے۔ باہر پورٹیکو سے لے کر بیرونی پھاٹک تک پورے احاطے میں جھلملاتی ہوئی کاریں جمع تھیں۔ ایک لمحے کے لئے عارف علی کو شبہ سا ہوا کہ شاید وہ

غلطی سے کسی اور کے مکان پر آ گئے ہیں، لیکن جب انہوں نے پھاٹک پر لگی ہوئی نیم پلیٹ دیکھی جو زبانِ خاموش سے ان کا منہ چڑھا رہی تھی، تو تلملا کر رہ گئے۔

گاڑی پھاٹک سے باہر ہی چھوڑ کر وہ کاروں کے درمیان چکراتے ہوئے ملازموں کے کوارٹر کی طرف آ گئے۔ اندر جانے سے پہلے وہ اس ہنگامے کی نوعیت جاننا ضروری سمجھتے تھے جو ان کی مرضی حاصل کئے بغیر کیا گیا تھا۔ ان کے پرانے اور وفادار ملازم رحمت نے، جو اٹھارہ سال سے ان کی خدمت کرتا چلا آ رہا تھا، جب عارف علی کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھا تو بوکھلا گیا۔ آگے بڑھ کر حیرت سے کہا۔

"مالک! آپ........."

عارف علی نے ملازم کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے قدرے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ اندر کیسا ہنگامہ ہو رہا ہے؟"

رحمت نے عارف علی کو غصے میں دیکھا تو گردن جھکا کر دبی زبان میں بولا۔

"مالک! آج چھوٹی بیگم صاحبہ کا جنم دن ہے۔"

"لیکن ناہید نے مجھ سے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔"

رحمت سر جھکائے خاموش کھڑا رہا تو عارف علی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بھلا ملازم اس سوال کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ چنانچہ بات بنانے کی خاطر پوچھا۔

"یہ طوفانِ بدتمیزی کب سے جاری ہے؟"

"مہمان سرِشام ہی جمع ہو گئے تھے مالک!" رحمت نے نرم آواز میں جواب دیا۔

"کون کون مہمان آئے ہیں؟"

"بہت سارے ہیں مالک! میں آپ کے پرانے واقف کاروں کے علاوہ اور کسی کو نہیں پہچانتا۔"

"ہوں........" عارف علی نے غصیلے لہجے میں کہا پھر کچھ سوچ کر کہا۔ "ناہید کو بلاؤ۔"

رحمت نے چونک کر پوچھا۔

"کیا اسی طرف بلا لاؤں مالک!؟"

"ہاں .... لیکن ٹھہرو .... تم ناہید کو علیحدہ بلا کر میرا پیغام دینا۔ دوسروں کو

اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔"

ملازم نے نظر اٹھا کر مالک کی طرف دیکھا۔ عارف علی کا چہرہ خون کی گردش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے، پھر گردن جھکا کر خاموشی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

شیخ عارف علی نے ہرچند کہ ناہید کی طرف سے چشم پوشی اختیار کر لی تھی لیکن وہ اس حد تک خود کو آمادہ نہ کر سکے کہ خود اپنی ہی چھت کے نیچے طوفانِ بدتمیزی کو روا رکھتے۔ چنانچہ ملازم کے جانے کے بعد کسی انجانے احساس کے تحت ان کے قدم بھی عمارت کی جانب اٹھ گئے۔

پچھلے راستے سے عمارت کے اندر داخل ہو کر وہ اس کمرے تک آ گئے۔ جہاں سے صدر ہال کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے کھڑکی پر پڑے پردے کی اوٹ سے ہال میں جھانکا تو تلملا کر رہ گئے۔ ناہید کے وہ تمام دوست اس وقت وہاں موجود تھے جن کے بارے میں عارف علی کی رائے کچھ اچھی نہ تھی۔ خاص طور پر پرنس اکبر کو دیکھ کر تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ شہر کے ایک بزنس مین سیٹھ بابر کا اکلوتا اور اوباش لڑکا تھا۔ اونچے طبقے میں ان دونوں کو عزت کی نظروں سے ضرور دیکھا جاتا تھا لیکن عارف علی بخوبی جانتے تھے کہ وہ دونوں کس قدر شریف ہیں۔ پھر یہ کہ سیٹھ بابر اور عارف علی میں کاروباری اعتبار سے آئے دن ٹھنی رہتی تھی۔ اس لئے جب انہوں نے پرنس اکبر کو وہاں دیکھا تو ہونٹ چبا کر رہ گئے۔ دل چاہا کہ ہال میں جا کر بھری محفل میں ان سب کو چلا چلا کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ دھکے مار کر باہر نکلوا دیں لیکن کچھ سوچ کر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

کھڑکی سے لگے کھڑے، ہال میں جنم لینے والے ہنگاموں کو نفرت اور حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ رحمت نے ناہید کو ایک طرف بلا کر کچھ کہا پھر الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ عارف علی نے ناہید کے چہرے پر ناخوشگوار تاثرات کی جھلکیاں دیکھیں تو اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئے۔

ناہید رحمت کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک گم صم کھڑی رہی۔ پھر اس نے پرنس اکبر کے قریب جا کر کچھ کہا اور وہ دونوں ہنگاموں سے کترا کر عین اس کھڑکی کے قریب آ گئے جہاں عارف علی موجود تھے۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ! تم اچانک پریشان کیوں ہو گئیں؟" پرنس اکبر نے ناہید سے کہا تھا۔

"ابھی رحمت میرے پاس آیا تھا۔" ناہید نے حقارت سے کہا۔ "اس نے مجھے سرونٹ کوارٹرز کی طرف آنے کو کہا ہے۔"

"وہ کمینہ .... رحمت ...." پرنس اکبر نے غصیلی آواز میں کہا۔

"تم غلط سمجھے پرنس، رحمت نے عارف کے حکم پر وہ پیغام مجھ تک پہنچایا ہے۔"

"اوہ .... وہ تمہارا بوڑھا کھوسٹ شوہر۔" پرنس اکبر کے لہجے میں زہریلا طنز تھا۔

"ہاں........." ناہید بولی۔ "وہ واپس آ گیا ہے۔"

"آ جانے دو، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"تم نہیں سمجھتے پرنس! وہ تم کو یہاں دیکھ کر کھوپڑی سے آؤٹ ہو جائے گا۔"

"پھر......... کیا میں چلا جاؤں؟"

"نہیں .... میں یہ بھی نہیں چاہتی۔" ناہید جلدی سے بولی۔ "تمہارے چلے جانے کے بعد محفل کی رنگینیاں پھیکی پڑ جائیں گی۔"

"عارف علی نے تم کو سرونٹ کوارٹرز کی طرف کیوں بلایا ہے؟"

"خدا جانے، ممکن ہے اس نے تم کو دیکھ لیا ہو۔" ناہید اضطرابی کیفیت میں بولی۔

"دیکھ لینے دو، مجھے اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔"

"پرواہ تو مجھ کو بھی نہیں ہے لیکن........."

"لیکن کیا........."

"مجھے ڈر ہے کہ جنونی حالت میں وہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کر بیٹھے جو میری شہرت پر اثرانداز ہو۔"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ تم کو طلاق دے دے گا۔"

"ہاں۔"

"ڈونٹ وری ہنی!" پرنس اکبر نے لاپرواہی سے کہا۔ "اگر تم اس بوڑھے سے طلاق لے سکو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ثابت ہو گا۔"

"تم نہیں سمجھتے پرنس!" ناہید نے جواب دیا۔ "اگر عارف نے مجھے طلاق دے دی تو زندگی کی یہ آسائشیں بھی مجھ سے روٹھ جائیں گی جنہیں میں کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں

چاہتی۔"

"خیال ہے تمہارا۔" پرنس اکبر بولا۔ "پھر تم یہ کیوں فراموش کر رہی ہو کہ یہ خادم بھی تمہارے حسن کے پرستاروں میں ہے .... عیش کرو گی۔"

"ایک بات پوچھوں پرنس!"

"پوچھو۔"

"کیا تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤ گے؟"

"شادی نہیں ڈارلنگ بلکہ سول میرج کہو۔" پرنس اکبر نے سرگوشی کی۔ "میں زندگی میں ہمیشہ دو ٹوک فیصلہ کرنے کا عادی رہا ہوں۔ اس لئے شادی کے بکھیڑوں میں پڑنا فضول ہے۔"

"ٹھیک ہے اگر تم سول میرج کے لئے آمادہ ہو تو میں تمہاری خاطر عارف کو ٹھوکر بھی مار سکتی ہوں۔"

شیخ عارف علی کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ جو کچھ وہ سن چکے تھے وہی بہت تھا۔ اس سے آگے سننے کی ان میں تاب نہ تھی۔ غصے میں پیچ و تاب کھاتے، مٹھیاں سختی سے بھینچے وہ دبے قدموں واپس سرونٹ کوارٹرز کی طرف پلٹ آئے۔ ناہید کے آخری جملے ان کے ذہن میں ہیجانی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے.........

بہتر یہی ہے کہ اب میں ناہید سے اپنے تمام رشتے اور ناطے توڑ لوں.........

آستین کے سانپ کا سر جتنی جلدی کچل دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے.........

اور.........

پھر ان کے ذہن کے پردوں پر ایک بار پھر شبانہ بیگم کا دھندلا دھندلا تصور ابھر آیا۔

شبانہ بیگم.........

جنہوں نے ہر حالت میں شوہر کی پرستش کی تھی۔ ان کی ہر بات کو مانا تھا۔ اس وقت بھی جب عارف علی بڑے چاؤ سے انہیں بیاہ کر لائے تھے.........

اور.........

اس وقت بھی جب ناہید ان کے آشیانے پر بجلی بن کر گری تھی.........

شبانہ بیگم نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ خاموشی سے شوہر کی خوشنودی کی خاطر ان کا راستہ صاف کرنے کی غرض سے ان کی دنیا سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ سوائے جہیز کے چند جوڑوں

اور چڑھاوے کے چند زیورات کے علاوہ انہوں نے کسی چیز کو بھی ہاتھ نہ لگایا تھا..........

اور..........

ناہید..........

اسے صرف دولت کی حاجت تھی..........

شوہر سے زیادہ اسے اپنی آزادی کا خیال تھا..........

اسے شوہر کے مزاج اور اس کے حکم سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے.......... عارف علی سے نہیں بلکہ ان کی دولت اور شہرت سے بیاہ رچایا تھا اور اسی دولت کی خاطر آج وہ انہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ بھی کر بیٹھی تھی۔

کم ظرف..........

ذلیل..........

فاحشہ..........

عارف علی کا ذہن بھٹی کی طرح دہک اٹھا۔ چہرہ خون کی سرخی سے تمتما رہا تھا۔ پشت پر ہاتھ باندھے وہ بڑے غصے کے عالم میں ٹہل رہے تھے کہ ناہید سامنے سے آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر کتنی مکروہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ آنکھوں میں بے حیائی کے ساغر چھلک رہے تھے۔

حسبِ دستور اس وقت بھی وہ بغیر آستینوں والی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اس کے عریاں بازو آج بھی گدرائے گدرائے نظر آ رہے تھے اس کی آنکھوں میں آج بھی مستی چھلک رہی تھی، آج بھی اس کے چہرے پر غازے اور لپ اسٹک کی تہیں موجود تھیں، جس کو اصلی سونا سمجھ کر عارف علی نے دولت کی جھنکار پر خرید لیا تھا.......... اپنا لیا تھا.......... نقلی اور ملمع کا احساس تو انہیں اب ہوا تھا جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

ناہید خراماں خراماں چلتی ان کے قریب آ کر رک گئی۔ پھر اس نے عارف علی کے چہرے کی کیفیت کا جائزہ لیا اور لاپرواہی سے مسکرا کر بولی۔

"آپ کب آئے؟"

عارف علی نے بڑی مشکلوں سے اپنے اندر اٹھنے والے طوفانوں کو روکتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"یہ اندر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے..........؟"

"ہنگامہ نہیں، میں اپنی سالگرہ کا جشن منا رہی ہوں۔"

"لیکن تم نے مجھ سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔"

"آپ کو خود ہی خیال ہونا چاہئے تھا۔"

"ناہید..........!" عارف علی کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"جی .... فرمائیے۔" ناہید کے جواب میں کھلا چیلنج موجود تھا، وہ عارف علی سے مرعوب ہو جانے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھی۔

"تمہیں مجھ سے اجازت لینی ضروری تھی۔" عارف علی غصے سے بولے۔

"اس گھر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا ہے۔" ناہید نے بڑی لاپرواہی سے پیشانی پر بل کھائی ہوئی زلف کی ایک آوارہ لٹ کو سر کی جنبش سے پیچھے کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے یہ ہنگامے بالکل پسند نہیں ہیں۔"

"یہ اطلاع میرے لئے نئی ہے۔" ناہید نے تعجب کا اظہار کیا۔ "پہلے تو آپ ہمیشہ اونچی پرواز کے قائل تھے۔"

"تم اس وقت اپنے شوہر سے گفتگو کر رہی ہو۔" عارف علی نے ہونٹ چبا کر کہا۔

"فی الحال مجھے اس کا احساس ہے، لیکن آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ فی الحال میں بھی آپ کی شریکِ حیات ہوں۔"

عارف علی اس "فی الحال" کی تکرار پر تڑپ اٹھے۔ وہ سمجھ رہے تھے ناہید کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ چنانچہ غصے سے تلملا کر بولے۔

"فی الحال سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"یہی کہ آپ جب تک چاہیں میں آپ کی شریکِ حیات رہ سکتی ہوں، لیکن آپ کو اس بات کا پاس ہونا ضروری ہے کہ میں بیوی ہوں ملازمہ نہیں ہوں جس کو جب دل میں آیا جو جی چاہا کہہ لیا۔"

"کیا پرنس اکبر بھی اندر موجود ہے؟" عارف علی نے ناہید کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے جھلا کر پوچھا۔

"ہاں .... ہے۔" ناہید نے نخوتِ حسن سے کہا۔ "مہمانوں کی لسٹ میں، مَیں نے اس کا نام سرِفہرست رکھا تھا۔"

"یہ جاننے کے باوجود کہ میرے اس کے تعلقات ہمیشہ سے کشیدہ رہے ہیں۔" عارف علی نے نفرت سے پوچھا۔

"اپنے اپنے مراسم کی بات ہے۔" ناہید نے توبہ شکن انگڑائی لے کر جواب دیا۔

"تم بے ہودہ ہوتی جا رہی ہو۔" عارف علی کا خون کھول اٹھا۔

"عارف..........!" اچانک ناہید نے کسی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح کینچلی بدل کر کہا۔ "میں سخت سُست سننے کی عادی نہیں ہوں۔ اس لئے زبان کو لگام دے کر بات کرو۔"

"تم عورت نہیں بلکہ عورت کے تقدس پر ایک بدنما داغ ہو۔" عارف علی بھی آپے سے باہر ہو گئے۔ "میں نے تم کو کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر مخمل کے گدیلوں پر بٹھا کر حماقت ہی کی تھی۔"

"غلط کہہ رہے ہو تم۔" ناہید نے بھرپور طنز کیا۔ "تم نے سوسائٹی میں اپنی عزت کو چار چاند لگانے کی خاطر میرے سہارے کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور میں نے از راہِ کرم تمہارے اوپر رحم کھا کر تمہاری درخواست کو قبول کر لیا تھا ورنہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیانی فاصلے کبھی نہ مٹتے۔"

"تم کو اپنی جوانی پر بڑا ناز ہے۔"

"ہاں۔" ناہید نے تڑپ کر کہا۔ "مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ میں نے تمہارے جیسے دولت مند کو بھی اپنے اشاروں پر نچایا ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے مجھے اپنانے کی خاطر اپنی وفاشعار بیوی اور معصوم بچی کو بھی گھر سے نکال دیا تھا؟"

"ناہید..........!" عارف علی گرجے۔

"عارف..........!" جواب میں ناہید کی آواز بھی تیز ہو گئی۔ "میں شبانہ نہیں ہوں جو تمہاری دھونس میں آ جاؤں گی۔ تم کو اگر میرے وقار کا لحاظ نہیں ہے تو مجھے بھی تمہاری عزت کا کوئی خیال نہیں ہو گا۔"

"ذلیل .... پرنس اکبر کے بل بوتے پر اچھل رہی ہے۔" عارف علی نے بڑی حقارت سے کہا۔ ان کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔

"اگر میں ذلیل ہوں تو تم بھی کمینے ہو جو کسی کی غیر موجودگی میں غرا رہے ہو.......... اگر ہمت ہے تو پرنس کے سامنے جا کر بات کرو .... وہ تمہارا منہ نوچ ڈالنے کی ہمت

رکھتا ہے۔"

"فاحشہ.........." عارف علی نے چلا کر کہا۔ "میں اب ایک منٹ کے لئے بھی تمہارے منحوس وجود کو اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا .... اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

"میں خود بھی اب تمہاری دہلیز پر تھوکنا گوارا نہیں کروں گی، لیکن اس سے پیشتر کہ میں اس سے گھر سے جاؤں تم کو مجھے طلاق دینی ہو گی۔"

"ہاں .... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" عارف علی نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ پھر تین بار اپنے الفاظ دہراتے ہوئے بولے۔ "مہر کی رقم میں کل ہی تمہارے پاس روانہ کر دوں گا۔"

ناہید کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ عارف علی اتنی جلد بازی میں کوئی آخری فیصلہ کر ڈالیں گے۔ اس لئے ایک ثانئے کے لئے اسے جیسے سکتہ ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے عارف علی کو دیکھتی رہی۔ پھر غصے سے پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

عارف علی نے بڑی حقارت سے جاتی ہوئی ناہید کو دیکھا پھر نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

☆------☆------☆

گھر میں شادی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ شبانہ بیگم کے پاس اتنا تو نہ تھا کہ دل کے سارے ارمان پورے کر سکتیں۔ پھر بھی جو کچھ تھا اسی میں جو ممکن تھا کر رہی تھیں۔ پڑوس کی دو چار عورتیں ہر وقت موجود رہتیں۔ کبھی نکاح کے جوڑے میں گوٹا ٹنک رہا ہوتا تو کبھی دوپٹہ میں کامدانی کا کام زوروں پر ہوتا۔

شبانہ بیگم خوش تھیں کہ قدرت نے انہیں موت کے منہ سے نکال کر اتنی مہلت دے دی کہ وہ اولاد کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکیں لیکن عاصمہ کو ان ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسکول سے واپس آ کر وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہتی۔ کسی گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہتی۔

ماں کی ایماء اور بھائی کے اصرار سے مجبور ہو کر اس نے شام کا ٹیوشن چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے وقت اب کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا۔ کمرے میں پڑے پڑے آنسو بہانے کے سوا اسے کوئی اور کام نہ تھا۔ جب کبھی شبانہ بیگم اسے اپنے پاس بلاتیں تو وہ جلدی جلدی اپنے آنسو خشک کر

کے سر جھکائے ان کے پاس چلی جاتی۔ خاموش بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہتی۔ ان کے چہرے پر ممتا کی خوشی دیکھتی تو ایک لمحے کے لئے اس کے دل کو قرار آ جاتا۔

وہ جو کچھ کر رہی تھی' ماں کی خوشنودی ہی کی خاطر تو کر رہی تھی' لیکن کبھی کبھی وہ بڑی سنجیدگی سے سوچتی کہ آخر یہ کیسی دنیا ہے جہاں ایک ہی گھر میں ایک ہی خاندان کے تین افراد بھی یکسانیت کی زندگی گزارنے سے معذور ہیں۔ حالات نے ایک مثلث کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔

ایک طرف شبانہ بیگم تھیں جو بیٹی کے شاندار مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر پھولی نہیں سما رہی تھیں۔

دوسری طرف آصف تھا جو بہن کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کی فکر لگائے بیٹھا تھا..........

اور..........

تیسری طرف عاصمہ کی خود اپنی ذات تھی جس نے ماں اور بھائی کی خوشیوں اور ان کے مستقبل کے سنہری خوابوں کے سامنے اپنی حسرتوں کو سینے میں دبا رکھا تھا۔ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی' لیکن دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا لیکن وہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔ دوسروں کی خوشیوں کی خاطر وہ اپنی زندگی کی بھینٹ دینے پر مجبور تھی۔

کس قدر مضحکہ خیز تھے وہ لمحات..........

خون کے رشتوں کے درمیان آنسو اور قہقہوں کی یہ کشمکش کتنی اذیت ناک تھی۔

اور..........

قسمت کی ستم ظریفی ان گوناگوں حالات پر دل کھول کر ہنس رہی تھی..........

آج بھی جب عاصمہ اسکول سے تھکی تھکی لوٹی تو شبانہ بیگم کے کمرے میں پڑوس کی دو تین عورتیں سر جوڑے بیٹھی کپڑوں کو سینے ٹانکنے میں مصروف تھیں۔ عاصمہ نے ایک نظر ان عورتوں پر ڈالی' پھر سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ جہاں آصف پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔ خلافِ توقع آج وہ کچھ سنجیدہ سنجیدہ سا لگ رہا تھا۔

عاصمہ نے اسے فکرمند دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے آصف! تم اس قدر بجھے بجھے کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں آپی! تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔" آصف نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

عاصمہ اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "آصف! میں تمہاری بڑی بہن ہوں.........."

"میں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے بھلا کب انکار کیا ہے؟" آصف نے چونک کر پوچھا۔

"تم نے آج تک کوئی بات مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔"

"آپی!" آصف الجھن میں پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے' اگر تم مجھے نہیں بتانا چاہتے تو میں تم کو مجبور بھی نہیں کروں گی۔" عاصمہ نے قدرے سردمہری سے کہا۔

"آپ ناراض نہ ہوں آپی!" آصف جلدی سے بولا۔ "میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن امی جان کو اگر حالات کا علم ہوا تو انہیں دکھ ہوگا۔"

"بات کیا ہے۔" عاصمہ سنجیدہ ہو گئی۔

"ابا جان نے ناہید بیگم کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔"

"اوہ .... لیکن اس میں تمہیں فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" عاصمہ نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ اطلاع سن کر خوشی ہوئی تھی۔

"ابا جان آج مجھ سے بھی ملے تھے.........."

"تم سے..........!" عاصمہ کا دل دھڑک اٹھا۔ "انہیں تم سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟"

"اتفاقاً ٹکراؤ ہو گیا تھا۔" آصف نے دبی زبان میں کہا۔

"لیکن انہوں نے تم کو پہچانا کس طرح؟"

"ابا جان کے ساتھ عبدل بھی تھا۔ وہی جو ہماری گلی کے آخری نکڑ پر رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسی نے بتا دیا ہو۔"

"کیا کہا تھا انہوں نے تم سے؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"امی جان اور آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"تم نے انہیں ہمارے حالات سے باخبر تو نہیں کیا؟"

"نہیں .... لیکن میرا خیال ہے کہ عبدل انہیں تھوڑے بہت حالات بتا چکا ہے۔"

"جہنم میں جائے عبدل۔" عاصمہ ہونٹ چبا کر غصے سے بولی۔ "تم نے اچھا کیا جو کچھ اپنی

زبان سے نہیں کہا۔"

"آپی..........!" آصف کے لہجے میں جھجک تھی۔

"کیا بات ہے؟" عاصمہ نے آصف کو غور سے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین نظر آ رہا تھا۔

"ابا جان نے مجھے گھر بلایا ہے۔"

"نہیں..........." عاصمہ نے تڑپ کر کہا۔ "تم اب ان سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

آصف نے بہن کی طرف دیکھا' پھر نظر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ عاصمہ محسوس کر رہی تھی کہ خون' خون سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ چند لمحے تک کمرے کے ماحول پر بڑی سوگوار سی خاموشی مسلط رہی۔ پھر عاصمہ نے دبی زبان میں کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو آصف!"

"کچھ نہیں۔" آصف کے لہجے میں درد تھا۔

"ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتاؤ گے؟"

"میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا آپی!"

"کیا تم ابا سے ملنا چاہتے ہو؟"

آصف نے ایک بار پھر نظریں جھکائیں تو عاصمہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"آپ نے میری خاموشی کا غلط نتیجہ اخذ کیا ہے آپی!" آصف سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "ابا جان ن دراصل مجھے ایک خاص مقصد کے لئے گھر آنے کی دعوت دی ہے۔"

"اب کیا مقصد ہے ان کا؟" عاصمہ نے نفرت سے پوچھا۔

"وہ .... وہ چاہتے ہیں کہ روٹھے ہوئے رشتے آپس میں دوبارہ.........."

"آصف..........!" عاصمہ چیخ اٹھی۔ "یہ ناممکن ہے' ایسا کبھی مت سوچنا اور پھر ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارے سینے کے اندر بھی دل ہے۔ کوئی پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے جس پر پے در پے ٹھوکر لگے اور وہ دھڑک نہ سکے۔ ہم کھلونا تو نہیں ہیں جس سے جب دل چاہے کھیلا جائے اور جب کھیلنے والے کا دل بھر جائے تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ نہیں آصف نہیں' خدا کے لئے تم ایسا کبھی مت سوچنا۔ تمہیں امی جان کے اس دودھ کی قسم جو انہوں نے تمہیں ان

حالات میں پلایا ہے جب ان کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ سر چھپانے کے لئے کوئی درخت کا سایہ بھی نہ تھا۔ تمہیں ان سہاگ کی نشانیوں کی قسم ہے جو تمہاری تعلیم و تربیت میں ایک ایک کر کے کوڑیوں کے مول بک چکی ہیں۔"

عاصمہ جذبات کی رو میں بہک کر کہے جا رہی تھی۔

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ناہید ہی کی خاطر ہمیں دھتکار کر نکالا گیا تھا۔ نئے کھلونے کی خوشی میں پرانے کھلونے اٹھا کر پھینک دیئے گئے تھے اور آج .... آج جب ناہید نے ابا جان کو چھوڑ دیا تو انہیں پھر ہمارا خیال آ رہا ہے۔ بارہ تیرہ سال کے عرصے میں آخر باپ کی محبت کو جوش کیوں نہ آیا۔ انہوں نے کبھی بھول کر بھی اس بات کے جاننے کی کوشش نہ کی کہ ہم زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔"

"آپی!" آصف بہن کی کیفیت دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

عاصمہ کہے جا رہی تھی..........

"امی جان نے محض ہماری پرورش کی خاطر مصیبت کے دن جھیلے ہیں۔ خود بھوکے رہ کے ہماری شکم سیری کی ہے۔ سہاگ اجڑ جانے کے صدمے میں انہوں نے تپ دق کے جراثیم پال لئے۔ سینی ٹوریم کی مدقوق فضا میں موت اور زندگی کی اذیتوں کو جھیلا ہے لیکن کبھی ہمیں اس بات کا احساس تک نہ ہونے دیا کہ ہمارے سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہیں ہے اور آج.......... آج جب ابا جان کو تنہائی کا احساس ستانے لگا تو انہیں ہماری یاد آ رہی ہے۔ یہ باپ کی محبت اور شفقت نہیں آصف! ایک مرد کی خودغرضی ہے جو باپ کی شکل میں آج تمہارے سامنے جھولی پھیلا رہی ہے' یہ وفا نہیں دغا ہے.......... فریب ہے .... مکاری ہے۔"

اور پھر عاصمہ کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ شدتِ جذبات سے اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ وہ بری طرح سسک اٹھی۔

"آپی .... آپی! خدا کے لئے نہ رو آپی .... میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو آپ کہیں گی ہمیشہ وہی کروں گا۔" آصف نے بہن کو لپٹا کر کہا اور خود بھی رو پڑا۔

پھر جب آنسوؤں کا سیلاب تھما تو عاصمہ نے رندھی آواز میں کہا۔

"ان باتوں کی اطلاع امی جان کو نہیں ہونی چاہئے ورنہ انہیں شدید افسوس ہو گا۔"

"میں کچھ نہیں کہوں گا آپی!"

"آئندہ تم عبدل سے بھی دور رہنا۔"

"آپ اپنے آنسو پونچھ لیجئے آپی! میں آپ کا ہر حکم مانوں گا۔" آصف نے بسورتے ہوئے کہا تو عاصمہ کو بھائی کی معصومیت پر بے اختیار پیار آ گیا۔

"تم ابھی بچے ہو آصف! ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو ڈالو' شاباش۔" عاصمہ نے محبت بھرے انداز میں آصف کے شانے تھپتھپا کر کہا تو آصف تھکے تھکے انداز میں سر جھکائے اٹھا اور خامشی سے باہر چلا گیا۔

عاصمہ کو تنہائی ملی تو دل میں سوئی ہوئی نفرت کا احساس پھر جاگ اٹھا وہ سوچنے لگی۔

آخر عارف علی نے ناہید کو طلاق کیوں دی.........؟

کیا ان کا دل اب ناہید سے بھی بھر گیا.........؟

پھر.........؟

کیا جس طرح شبانہ بیگم کی جگہ ناہید نے لی تھی اسی طرح ناہید کی جگہ اب کوئی دوسری عورت لے گی؟

کیا عورت دنیا میں کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟

کیا وہ صرف اسی لئے تخلیق کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ کھلونے کی طرح کھیلا جائے.........؟

پاؤں کی جوتی کی طرح آئے دن بدل دیا جایا کرے.........؟

آج نئی.........

کل پرانی......... اور.........

اگر صرف جوانی اور رنگ و روپ ہی عشق کی معراج ہے تو پھر وفا کسے کہتے ہیں؟

عاصمہ کا ذہن الجھتا رہا' ماضی اور حال کے واقعات نے اس کے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی اور پھر.........

اچانک عاصمہ کا پورا وجود لرز اٹھا......... کانپ کر رہ گیا......... معاً اسے خیال آ گیا کہ چار پانچ روز بعد وہ بھی دلہن بننے والی ہے۔ سرخ جوڑے میں سجا کر اور خوشبوؤں میں بسا کر اسے بھی شبانہ بیگم اور ناہید کی طرح ایک مرد کے حوالے کر دیا جائے گا۔

اس کے آنگن میں بھی شہنائی بجے گی.........

خوشیوں کے ترانے گونجیں گے.........

بدائی کے گیت گائے جائیں گے.........

ہجولیوں کے جھرمٹ میں ماں کی دعاؤں کے ساتھ اسے ڈولی میں بٹھا دیا جائے گا.........

ایک نئے گھر سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا.........

آغاز.........

جس میں قدم قدم پر خوشیاں ہوں گی.........

ناز برداریاں ہوں گی.........

حسین وعدے کئے جائیں گے.........

وفا کی قسمیں کھائی جائیں گی......... لیکن.........

انجام کیا ہو گا.........؟

عاصمہ نے سہم کر سوچا۔

کیا جب شبانہ بیگم کی طرح اس کی جوانی بھی ڈھل جائے گی تو اسے بھی دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے گا.........؟

کیا ناہید کی طرح کوئی دوسری عورت اس کی ہنستی کھیلتی دنیا کو اجاڑ کر رکھ دے گی' اور پھر اس کی محرومیوں کے کھنڈرات پر ایک نیا تاج محل تعمیر کیا جائے گا؟

کیا مرد سے وفا کرنے کے بدلے میں ایک دن اسے بھی در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی.........؟

عاصمہ کا ذہن الجھتا رہا۔ اسے بڑی شدت سے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ مستقبل کے بھیانک خواب اس کی سہمی ہوئی معصومیت پر خون آشام بھیڑیوں کی طرح اپنے نوکیلے دانت باہر نکالے جھپٹ رہے تھے۔ قسمت اس کی مجبوریوں پہ قہقہہ زن تھی اور حالات کے دھارے نے جیسے اسے گنگ کر ڈالا تھا۔

آصف کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک اپنی سوچوں میں گم رہی۔ پھر انہی پریشان پریشان خیالات کے درمیان نہ جانے کب وہ بستر پر لیٹی تھی اور کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام کو سو کر اٹھی تو جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا سا درد تھا اور طبیعت مضمحل ہو رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی پھیل کر گہری ہو چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر لالٹین جلائی۔ باہر آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ چائے تیار کر کے ماں کے کمرے میں گئی تو وہاں شبانہ بیگم کے علاوہ ایک دو عورتیں اب بھی دھرنا جمائے بیٹھی تھیں۔ آصف کہیں گیا ہوا تھا۔ عاصمہ نے پیالیوں میں چائے انڈیل کر عورتوں کو دی۔ پھر ماں

کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نکاح اور چوتھی کے جوڑے فرش پر بچھی چاندنی پر پڑے تھے اور ان میں ٹکی ہوئی کرن اور کامدانی ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں جھلملا رہی تھی۔

عاصمہ کا دل چاہا ان جوڑوں کو آگ لگا دے جو اس کی زندگی میں زہر گھولنے کے لئے مسکرا رہے تھے۔ دمک رہے تھے۔ یہی جوڑے تو تھے جنہوں نے نہ جانے کتنے گھر اجاڑے تھے۔ نہ جانے کتنی وفاؤں کو پامال کیا تھا۔ کتنے ارمان بھرے دلوں کو روند ڈالا تھا۔ کتنی امنگ بھری جوانیوں کو خزاں رسیدہ درخت کی طرح ویران اور اجاڑ اجاڑ کر دیا تھا۔

وہ حقارت بھری نظروں سے ان سرخ جوڑوں کو گھورتی رہی۔ پھر جانے کے لئے اٹھی تو ماں نے روک کر کہا۔

"عاصمہ بیٹی! میرا خیال ہے کہ کل تم اسکول سے استعفیٰ دے دو۔"

"جی.........!" عاصمہ نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ اسے ماں کے اس مشورے پر حیرت ہوئی تھی۔ اس نے تو ماں کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ جب تک آصف کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہے وہ اپنی ملازمت برقرار رکھے گی۔

"شادی میں اب دن ہی کتنے باقی رہ گئے ہیں۔" شبانہ بیگم نے کہا۔ "کل شام نسیمہ بیگم مہندی کی رسم ادا کرنے آ رہی ہیں اس کے بعد تم کو مایوں بٹھا دیا جائے گا۔"

"امی جان! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں بیس پچیس روز کی رخصت منظور کرا لوں۔" عاصمہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میں سمجھ رہی ہوں تمہارا مقصد، لیکن مناسب یہی ہے کہ اب تم ملازمت کا خیال ترک کر دو۔"

"کیا آپ نے خالہ جان سے میری خواہش کے سلسلہ میں بات نہیں کی تھی۔" عاصمہ نے دبی زبان میں پوچھا۔

"کی تو تھی لیکن انہوں نے دبی زبان میں انکار کر دیا۔"

"کیا یہ انکار خالہ جان کی طرف سے تھا؟" عاصمہ نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ ثاقب کو یہ بات گوارا نہیں ہے کہ تم شادی کے بعد بھی ملازمت کرو۔" شبانہ بیگم نے کہا پھر بولیں۔ "اور پھر تمہیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ثاقب کے یہاں اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ دونوں ہاتھ سے خرچ کرو گی جب بھی چکائے نہ چکے

گا۔"

"نصیب کی بات ہے بہن، ورنہ اتنے اچھے لڑکے آج کل ملتے کہاں ہیں۔" فرش پر بیٹھی ہوئی ایک عورت نے شبانہ بیگم سے کہا۔

"راج کرے گی میری عاصمہ بیٹی۔" دوسری نے عاصمہ کو دعا دی۔

"سب خدا کا کرم ہے بہن! وہ جسے چاہے نواز دے۔" شبانہ بیگم نے کہا۔ "پھر عاصمہ کو دیکھ کر بولیں۔ "تم آصف کی فکر نہ کرو، وہ ملازمت کر رہا ہے اسی میں سے پڑھائی کے خرچ بھی نکل آئیں گے۔ پھر ثاقب نے وعدہ کیا ہے کہ دو چار مہینے میں اس کی مزید ترقی کرا دیں گے۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ ثاقب ابھی اس کی زندگی کا دعویدار ہی تو تھا۔ ابھی تو وہ ثاقب کے ساتھ کسی رشتے میں منسلک بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن ثاقب نے ابھی سے اس پر اپنا حق جتانا شروع کر دیا تھا۔ حکم دینے شروع کر دیئے تھے۔

عاصمہ نے ہرچند کہ ماں کے سامنے زبان نہ کھولی تھی۔ سرنگوں ہو گئی تھی لیکن اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ اس کی روح کی گہرائیوں پر ایک کاری ضرب لگی اور نفرت کے جذبے میں ابال آ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ماں کی خواہشات کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر ضرور لگا دے گی لیکن ثاقب کی برتری کو کبھی قبول نہیں کرے گی۔ وہ اسے بتا دے گی کہ عورت اگر وفا کے نام پر قربان ہو جانے کی اہلیت رکھتی ہے تو بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ بھی کر سکتی ہے۔

وہ عورت کے تقدس کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دے گی..........
عورت کی عظمت کا پرچم ہمیشہ بلند رکھے گی..........
عورت کے وقار کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے دے گی..........

"کیا سوچا ہے تم نے عاصمہ!" شبانہ بیگم نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر امی جان! میں کل ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دوں گی۔" عاصمہ نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔" شبانہ بیگم نے جھولی پھیلا کر دعا دی۔ "دودوں نہاؤ پوتوں پھلو۔"

عاصمہ کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے سوچا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ماں نے اسے موت کی

دعا دی ہوتی۔

موت ....

جو زندگی کے ہنگاموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد علاج ہے...........

جو زندگی کی سرحدوں سے اس پار ایک نئی دنیا کا نام ہے...........

جہاں انسان دوسروں کے کئے کی نہیں بلکہ صرف اپنے اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے.........

☆======☆======☆

عاصمہ کے احساسات اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ وہ مہر بہ لب سب کچھ دیکھ رہی تھی' سب سن رہی تھی لیکن زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

شادی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا' گھر میں ہر وقت ڈھولک کی آواز گونجتی رہتی' پڑوس کی لڑکیاں شادی بیاہ کے گیت لہک لہک کر گاتی تھیں لیکن عاصمہ کو اب ان باتوں اور ان گیتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو اس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی جب ماں کی خواہشات کی تکمیل کی خاطر وہ اپنے ارمانوں کا لاشہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے اس گھر کو خیرباد کہے گی جس کی ایک ایک شے اور ایک ایک ذرے سے اسے پیار تھا۔ وہ بھائی کے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر قربانی کی گائے کی طرح بِک جانے کو تیار تھی۔ اس نئی دنیا کو اپنانے کے لئے پوری طرح خود کو تیار کر چکی تھی جو بقول شبانہ بیگم کے اس کی اپنی دنیا ہو گی۔

ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا...........

ایک نئی دنیا ہو گی..........

الگ تھلگ..........

جہاں اس کو پورا پورا اختیار ہو گا..........

اس کی زبان پر مہرِ خاموشی نہیں ہو گی..........

وہ آزاد ہو گی..........

بالکل آزاد.......... اور ....

وہ اس آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کا عہد کر چکی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ثاقب کو ماں کی خوشیوں اور بھائی کے مستقبل کی خاطر اپنا بنا لے گی لیکن خود اس کی کبھی نہ بنے گی۔

آج اسے رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہا تھا جب وہ سہمی سہمی ماں کے سینے سے لپٹی ہوئی باپ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ شبانہ بیگم کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان امڈ رہا تھا۔ جب انہوں نے آخری بار پلٹ کر اپنے زندگی کے ہم سفر عارف علی کو ویران ویران نظروں سے دیکھا تھا پھر عاصمہ کو سینے سے بھینچ کر اس دہلیز کو خیرباد کہا تھا۔ جہاں ایک روز وہ دلہن بن کر سینے میں لاکھوں امنگیں اور ہزاروں تمناؤں کو دامن میں سمیٹے داخل ہوئی تھیں۔

عاصمہ کو یاد تھا جب باپ نے شبانہ بیگم کی طرف سے نگاہیں پھیر کر نفرت کا اظہار کیا تھا اور اس کی تمام معصوم حسرتیں دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئی تھیں' لیکن اس وقت وہ ایک بچی تھی اس میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں تھی کہ زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھ سکتی' مگر اب وہ جوان ہو چکی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی سوچوں کے زاویے بھی بڑھتے گئے تھے اور حالات اور واقعات کی نزاکت نے اس کے ذہن کو پختگی بخشی تھی۔

شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے بستر پر خاموش بیٹھی اپنے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آج اس کی غزالی آنکھوں میں آنسوؤں کی معمولی سی نمی بھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے سینے پر صبر کے پتھر رکھ کر اپنے آنسوؤں کو دل کی گہرائیوں میں دبا دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ آنسو بہا کر عورت کی مجبوریوں کا مذاق نہیں اڑائے گی۔

باہر کھلے صحن میں پاس پڑوس کی لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر ایک نیا گیت چھیڑ دیا تھا۔

سجنا آئے ہیں..........

ڈولی لائے ہیں..........

سہیلیو..........

اب تو بڑھاؤ میری شان..........

تاروں سے میری مانگ بھرو..........

عاصمہ نے گیت کے بول سنے تو تڑپ اٹھی۔ اس کا چہرہ خون کی تمازت سے کندن کی طرح دہک اٹھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر بیزاری کے اظہار کے طور پر آڑی ترچھی سلوٹیں نمایاں ہو گئیں۔ آنکھوں سے نفرت چھلک پڑی۔ اس کا دل چاہا کہ باہر جا کر ان

لڑکیوں کا منہ نوچ ڈالے جو اس کے جذبات کی ترجمانی غلط انداز میں کر رہی تھیں۔

آخر انہیں اس کی مجبوریوں کا مضحکہ اڑانے کا کیا حق تھا............؟

کیوں وہ اس کے دل کے سکون کو پامال کرنا چاہتی تھیں.........؟

آخر کیوں..........؟

کس لئے...........؟

کیا عورت ہو کر بھی وہ عورت کے دل کے درد کو سمجھنے سے قاصر تھیں...........؟

عاصمہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خوشیوں کا گیت نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر اس کی بے بسی کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں' دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں۔

کانوں کو بند کئے وہ بہت دیر تک بے چینی کے عالم میں ٹہلتی رہی۔ پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر ہتھیلیوں پر رچی مہندی کی رنگت کو دیکھا جو اس کے اپنے خون کی طرح سرخ سرخ نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیلے کپڑوں سے ابٹن کی بھینی بھینی خوشبو پھوٹ رہی تھی اور زرد لباس کو تو وہ نہ جانے کتنی بار حقارت سے دیکھ چکی تھی جو ابٹن کی رسم ادا کرنے کے بعد اسے زبردستی پہنا دیا گیا تھا اور پھر اسے مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔

مایوں کی رسم کے بارے میں اس نے یہی سنا تھا کہ شادی سے کچھ روز قبل لڑکی کو ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس کے جسم پر روزانہ ابٹن ملا جاتا ہے۔ اس کی تنہائی میں دوسروں کو مخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی' صرف بے تکلف اور ہم عمر سہیلیاں آ جا سکتی ہیں اور اس تنہائی کے پُرسکون لمحات میں بیٹھ کر لڑکی اپنے محبوب کے تصور میں بیٹھے بیٹھے اور سہانے سہانے خواب دیکھتی ہے۔ اپنی امنگوں اور اپنی آرزوؤں کو سینے سے لگائے اس دن کا انتظار کرتی ہے جب اس کا محبوب دولہا بن کر آئے گا اور اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ سہیلیوں کے بے باک مذاق سن کر وہ کبھی ہنس دیتی ہے کبھی مسکرا دیتی ہے اور کبھی لجا کر چھوئی موئی کے معصوم پودے کی طرح خود اپنے ہی وجود میں سمٹ جاتی ہے۔

"لیکن .... مجھے مایوں کیوں بٹھایا گیا ہے؟" عاصمہ نے سوچا۔

"میں نے تو کسی محبوب کے تصور میں کبھی کوئی سہانے خواب نہیں دیکھے...........

میرے دل میں تو کوئی امنگ نہیں ہے............

کوئی آرزو نہیں ہے...........

مجھے تو اس ڈولی کا انتظار نہیں ہے جس میں بیٹھنے کی تمنا جوان دلوں کو گدگدا دیتی ہے..............

پھر..........

یہ سب کیوں ہو رہا ہے...........!!

وقت جوں جوں گزرتا جا رہا تھا عاصمہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ تمام دن وہ ڈھولک کی تھاپ پر قسم قسم کے گیت سنتی رہی .... تلملاتی رہی .... اندر ہی اندر الجھتی رہی' لیکن جب رات کی تاریکی نے اپنا دامن پھیلایا تو ہنگامے رفتہ رفتہ ختم ہونے لگے۔ پاس پڑوس کی لڑکیاں ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ صحن میں اب صرف شبانہ بیگم اور ایک آدھ بڑی بوڑھیاں رہ گئی تھیں جو سر جوڑے کل کے بارے میں مشورے کر رہی تھیں۔

عاصمہ کا ذہن سوچ سوچ کر بُری طرح تھک چکا تھا۔ اس کی حالت اس پرندے سے مختلف نہیں تھی جس کے پر کتر کر قفس میں قید کر دیا گیا ہو اور پھڑپھڑانے کی اجازت بھی نہ دی گئی ہو۔ بستر پر لیٹی وہ آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

آنے والا کل..........

جو اس کی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک مرد کے سپرد کرنے والا تھا۔

مرد..........

جسے اس نے باپ کے روپ میں دیکھا تھا...........

جو خوبصورت کھلونوں سے کھیلنے کا عادی تھا............

جس کے نزدیک عورت کی حیثیت پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہ تھی............

جس نے دولت کے بل بوتے پر ناہیدؔ کی جوانی کو خرید لیا تھا...........

مرد..........

جو ثاقب کی شکل میں اس کی زندگی میں داخل ہونے والا تھا وہ بھی دولت مند تھا..........

اس نے بھی تو دولت ہی کی جھلک دکھا کر شبانہ بیگم کے احساسات کو متاثر کیا تھا..........

ایک زندگی کا سودا کیا تھا............

عاصمہ سوچتی رہی، اس کے خیالوں کے کینوس پر بے شمار رنگ ابھرتے اور سمٹتے رہے اور پھر نہ جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ کر وہ دنیا و مافیہا کے ہنگاموں سے بے خبر ہو گئی............

دوسری صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو نئے ہنگامے جاگ چکے تھے۔ باہر صحن میں عورتوں کا شور و غل ہو رہا تھا۔

عاصمہ جلدی سے اٹھی۔ پچھلے راستے سے باہر جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم عمر لڑکیوں کا ایک ریلا اس کے کمرے میں آ گیا۔

عاصمہ نے سرسری نظر سے انہیں دیکھا۔ پھر دل مسوس کر رہ گئی۔ سب ہی کے چہرے دمک رہے تھے۔ سب ہی کے ہونٹوں پر پُرکیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سب کی آنکھوں میں شوخی مچل رہی تھی، لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی عاصمہ کی کیفیت کا احساس نہ تھا۔

"ارے عاصمہ! تم نے ابھی تک بالوں کو بھی نہیں سنوارا۔"

ایک لڑکی نے جو عاصمہ کے پڑوس میں رہتی تھی، حیرت سے پوچھا۔

"جلدی کرو بھئی، خالہ جان بار بار پوچھ رہی ہیں۔" دوسری بولی۔

"میری مانو تو ان زلفوں کو یوں ہی الجھا رہنے دو۔" تیسری نے تجویز پیش کی۔

"کیوں............؟"

"اُلجھی ہوئی زلفوں میں شکار زیادہ آسانی سے پھنس سکتا ہے۔"

گھٹے گھٹے ماحول میں نقرئی قہقہے کھنک اٹھے۔ عاصمہ خاموش تماشائی کی طرح چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی سب کچھ سننے پر مجبور تھی............

"ارے .... یہ ہماری عاصمہ بہن اتنی دیر سے مراقبے میں کیوں ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"ثاقب بھائی کے تصور میں ڈوبی ہوئی ہیں۔" دوسری آواز ابھری۔

"تقدیر کی بات ہے، ورنہ اتنا اچھا رشتہ تو ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔" ایک اور لڑکی بولی۔

"اس پوری آبادی میں ثاقب جیسا ایک جوان بھی نہیں ہے۔"

"تمہاری رال کیوں ٹپک رہی ہے منو!" دوسری نے جواب دیا تو ثاقب کی تعریف کرنے والی لڑکی جھینپ گئی۔

اور پھر............ وقت کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔ صبح کا نور دوپہر کی تپش میں مدغم ہو گیا۔

دوپہر گزری اور شام آ گئی۔ صحن کے ہنگاموں میں اضافہ ہونے لگا لیکن عاصمہ تن بہ تقدیر خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا دل مستقبل کے تصور سے دھڑک رہا تھا۔ پریشان پریشان خیالات کا ایک ہجوم تھا جس نے اسے گھیر کر مہر بہ لب کر دیا تھا۔ نظریں جھکائے وہ دل ہی دل میں اپنی بے کسی پر ماتم کناں تھی لیکن تقدیر اس کی بے بسی پر دل کھول کر قہقہہ لگا رہی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے نسیمہ بیگم طے شدہ پروگرام کے تحت مختصر سی بارات لے کر آ گئیں۔

باہر سے لڑکیوں کا شور ابھرا............

"بارات آ گئی .... بارات آ گئی............"

عاصمہ کو مجبوراً دولہن بننا پڑا۔ محلے کی شوخ و شنگ لڑکیوں نے اسے اپنے جھرمٹ میں لے رکھا تھا۔ کوئی اس کی مانگ میں افشاں بھر رہی تھی، کوئی اس کی چوٹی میں پھول گوندھ رہی تھی اور عاصمہ سہمی سہمی سرخ جوڑے میں سمٹی سمٹائی بت بنی بیٹھی تھی۔

پھر جب وہ دلہن بن چکی تو لڑکیوں نے تنقیدی نظروں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور دبی دبی سرگوشیاں سر ابھارنے لگیں۔

"خدا کی قسم .... کتنی پیاری لگ رہی ہے عاصمہ۔"

"چہرے پر کس بلا کا نور آیا ہے............"

"دل چاہتا ہے منہ چوم لوں............"

"کس قدر حسین لگ رہی ہے، ایمان سے کہنا............"

"اگر میں مرد ہوتی تو ثاقب کے فرشتے بھی عاصمہ کو بیاہ کر نہ لے جا سکتے............"

"افشاں یوں چہرے پر دمک رہی ہے جیسے گھونگھٹ میں کہکشاں سمٹ آتی ہے۔"

ایک لڑکی نے بڑی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ثاقب کی قسمت پر تو مجھے رشک آ رہا ہے۔ کیسی چاند جیسی دلہن مل رہی ہے۔"

دوسری بولی۔

"چشمِ بد دُور........... جوانی جیسے پھٹی پڑ رہی ہے۔"

تیسری نے جل کر کہا۔

"اے بس رہنے بھی دو' یہ موقع ہی ایسا ہوتا ہے کہ بدصورت چہرے بھی کِھل اٹھتے ہیں..........."

اور..........

عاصمہ سر جھکائے سب کچھ سن رہی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ نسیمہ بیگم اور شبانہ بیگم نے اندر داخل ہو کر لڑکیوں سے چادر تاننے کو کہا۔ پھر قاضی کو اندر بلایا گیا۔ نکاح پڑھانے کی رسم خدا کے نام سے شروع ہوئی۔ قاضی بڑے والہانہ انداز میں قرأت کرتا رہا۔ پھر جب اس نے نکاح کے بول ادا کرنے کے بعد عاصمہ سے پوچھا کہ کیا تم نے قبول کیا تو عاصمہ کا دل تڑپ اٹھا۔ دل میں طوفان موجزن تھا اور وہ گردن جھکائے سوچ رہی تھی کہ کیا خود اسے اپنی زبان سے اپنی مرضی کے خلاف اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا پڑے گا' خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی گردن میں پھانسی کا پھندہ لگانا ہو گا۔

یہ کیسی رسم تھی..........؟

کیسا رواج تھا..........؟

"کیا تم نے قبول کیا..........؟" قاضی نے دوسری بار سوال کیا تو شبانہ بیگم عاصمہ کے قریب آ گئیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

"کہہ دو بیٹی کہ تم نے منظور کیا.........."

لیکن عاصمہ خاموش رہی۔ اس کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرے پھیل رہے تھے۔ گھُپ اور مہیب اندھیرے جس میں اسے اپنا دم سینے میں گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

کمرے کے ماحول پر ایک بے کیف سا جمود طاری تھا..........

تیسری بار جب قاضی نے اپنا سوال دہرایا تو شبانہ بیگم نے ایک بار پھر عاصمہ سے کہا۔

"کہہ دو بیٹی کہ تم نے منظور کیا.........."

عاصمہ نے ماں کے الفاظ سنے تو آہستہ سے گردن اور جھکا لی۔ پیچھے سے کسی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں۔"

اور پھر مبارک سلامت کے شور میں نکاح کی رسم پوری ہو گئی۔

رخصتی کا وقت آیا تو شبانہ بیگم نے سمٹی سمٹائی عاصمہ کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ پڑوس کی ایک بزرگ خاتون اسے باہر تک لائیں۔ دروازے پر پہنچ کر شبانہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"عاصمہ! میری بچی' آج تم ماں کی آغوش سے جدا ہو کر ایک نئے گھر جا رہی ہو۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہو۔ میری دعا ہے کہ خدا تم کو ہمیشہ سہاگن بنائے رکھے اور تم کو شوہر کا سکھ چین نصیب ہو اور آج سے تم اسی گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ ساس کو اپنی ماں سمجھ کر اس کی خدمت کرنا اور .... اور .... یہ نصیحت گرہ میں باندھ لو میری لاڈلی کہ لڑکیاں شوہروں کے گھروں سے مر کر ہی نکلتی ہیں۔"

شبانہ بیگم کی آواز بھرا گئی تو عاصمہ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ ماں کے کندھے پر سر ٹکا کر پھوٹ پڑی..........

"عاصمہ! میری آنکھوں کی ٹھنڈک' یہ سمجھ لو کہ آج سے اس گھر کے دروازے تمہارے لئے بند ہو گئے ہیں۔ ہنسی خوشی جب چاہو آ سکتی ہو' لیکن شوہر کی مرضی کے خلاف کبھی اس گھر کا رخ نہ کرنا۔ وہ تمہارا مجازی خدا ہو گا۔ اس کی پرستش تمہارے اوپر فرض ہو گی۔"

عاصمہ بدستور سسکتی رہی تو نسیمہ بیگم آگے بڑھ کر بڑے چاؤ سے بولیں..........

"کیسی باتیں کرتی ہو شبانہ بہن' عاصمہ اب بھی تمہارے دل کا چین اور کلیجے کی ٹھنڈک بنی رہے گی۔ میں نے تو تم کو لڑکا دے کر لڑکی لی ہے۔"

"نسیمہ بہن! میری لاڈلی کا خیال رکھنا۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی سکھ اور چین نہیں پایا۔ اس کا دل دکھا ہوا ہے۔ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی پونجی آج تمہارے حوالے کر رہی ہوں' اس کا خیال رکھنا۔" شبانہ بیگم نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر عاصمہ کو سینے سے لگا کر بولیں۔ "جاؤ میری لاڈلی! میں تمہیں خدا کی حفاظت میں وداع کرتی ہوں۔"

نسیمہ بیگم نے آگے بڑھ کر عاصمہ کو سہارا دیا۔ پھر شبانہ بیگم کے ساتھ مل کر اسے پھولوں سے سجی کار تک لے آئیں۔ آصف دور کھڑا بہن کو رخصت ہوتے دیکھ رہا تھا۔ عاصمہ لرزتے قدم اٹھاتی کار کے قریب پہنچی تو وہ دوڑ کر بہن سے لپٹ گیا۔

"آپی! .... میری اچھی آپی! مجھے بھول مت جانا.........."

"آصف..........!" عاصمہ کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا پھر اس نے آصف کو پیار سے اپنی کشادہ آغوش میں بھینچ لیا۔

"آپی! اگر کبھی مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اسے معاف کر دینا۔" آصف نے گلوگیر آواز میں کہا تو عاصمہ کا دل غموں کے بوجھ سے پھٹ گیا۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے آنسو اُبل رہے تھے' سینے میں طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر اُس نے اپنے ہونٹ بڑی سختی سے دبا رکھے تھے۔ وہ قبل از وقت اس چنگاری کو ہوا دینا نہیں چاہتی تھی جو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک مدت سے سلگ رہی تھی۔

شبانہ بیگم آنسو پونچھتی آگے بڑھیں' آصف کو عاصمہ سے علیحدہ کیا پھر اسے کار میں بٹھا دیا۔

اندر سے ڈھولک کی آواز کے ساتھ ساتھ مراثنوں کی آواز بھی آ رہی تھی جو اس وقت بابل گا رہی تھیں۔

اے سکھی..........
تُو آج اپنا گھر چھوڑ کر پرائے گھر جا رہی ہے
آج سے تُو اپنے ماں باپ کے لئے مر چکی ہے
اب تجھے ایک نئی دنیا بسانی ہو گی
ہم سکھیاں تجھے یاد کر کے رویا کریں گی
آج سارے پرانے ناطے ٹوٹ رہے ہیں
ماں کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی ہے
بیرن تجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے
ماں کی پونجی آج لٹ رہی ہے
لیکن تُو مجبور ہے..........
آج تُو پرائے دیس جا رہی ہے..........

اور .... عاصمہ گھونگھٹ میں سر جھکائے بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ گیت کا ایک ایک بول اس کے دل پر تیر و نشتر بن کر چبھ رہا تھا..........

زندگی کے ایک نئے راستے کے تصور نے اسے سہما دیا تھا۔

پھولوں کی مہک..........

سرخ جوڑے سے پھوٹتی ہوئی عطر کی خوشبو..........

اور..........

ماحول کی رنگینیاں جیسے اُسے زہر لگ رہی تھیں..........

لیکن وہ مجبور تھی..........

مجبور اور بے بس..........!

☆======☆======☆

حجلۂ عروسی میں بیٹھی وہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ' سہمی سہمی نظروں سے بار بار دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

معطر معطر سی خواب گاہ میں دنیا کی تمام آسائشیں زبانِ خاموش سے اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتی نظر آ رہی تھیں۔ پھولوں کی سیج جیسے اس کے لئے کانٹوں کا بستر بن گئی تھی' اور وہ سوچ رہی تھی کہ آج کی رات کیسے کٹ سکے گی..........

آج تو اس کی سہاگ رات تھی..........

سہاگ رات..........

جس کے لئے نوجوان دلوں میں نہ جانے کتنے ارمان اور کتنی امنگیں مچلتی رہتی ہیں..........

اسی رات کو تو دنیا والوں نے مرادوں والی رات بھی کہا ہے..........

جب دو دلوں کی دھڑکنیں سمٹ کر ایک ہو جاتی ہیں..........

دو وجود ہم آہنگ ہوتے ہیں..........

دو انسان ایک دوسرے میں مدغم ہو کر رہ جاتے ہیں..........

لیکن..........

عاصمہ کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو اپنے دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ ثاقب کے قریب رہ کر بھی ہمیشہ اس سے دور رہے گی۔ ان فاصلوں کو کبھی کم نہ ہونے

دے گی۔ اس نے ماں کی خوشیوں کا بھرم قائم رکھنے کے لئے خود کو حالات کے سپرد ضرور کر دیا تھا' لیکن اس کے ساتھ ہی محتاط رہنے کی قسم بھی کھائی تھی اور پھر اس شادی میں اس کی اپنی پسند یا اپنی مرضی کو کوئی دخل نہ تھا۔ نہ ان کے دل میں شہنائیوں کی آواز سن کر ولولے جاگے تھے۔ نہ جذبات میں کوئی طغیانی آئی تھی۔ یہ شادی تو محض کاروباری اصول کی ٹھوس بنیادوں پر ہوئی تھی۔ جس میں اس کی ماں کی تمنائیں شامل تھیں۔ بھائی کا مستقبل وابستہ تھا۔ خود اس کی اپنی خوشیوں نے تو اسی وقت دم توڑ دیا تھا جب وہ لرزتے قدموں سے سجی ہوئی موٹر کار میں دھڑکتے دل سے داخل ہوئی تھی۔

وقت کی رفتار کس قدر مدھم ہو گئی تھی۔ ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ حجلۂ عروسی کی خواب ناک سی روشنی کسی بجھتے ہوئے چراغ کی مانند ٹمٹما رہی تھی۔ سہرے کی لڑیوں میں پروئے ہوئے پھولوں کی مہک اسے زہر لگ رہی تھی۔ ہاتھوں پر لگی مہندی کا رنگ نہ جانے کیوں اسے زرد زرد سا محسوس ہو رہا تھا اور سرخ جوڑا..........

باہر کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری تو اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ حریری آنچل کی اوٹ سے اس نے پلکوں کے درمیان تھوڑی سی جھری بنا کر کنکھیوں سے دیکھا اور اس کا پورا وجود لرز گیا۔

ثاقب دروازے کے درمیان کھڑے اس کی طرف بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چوڑی دار پاجامے اور پوت کی شیروانی میں مردانہ وقار کا حُسن کس قدر نکھرا نکھرا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر کس قدر معصومیت تھی اور آنکھیں .... ان میں آج بھی وہی سادگی اور بانکپن موجود تھا جسے عاصمہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ آج تو اس سادگی اور بانکپن میں کئی گنا اضافہ نظر آ رہا تھا۔

عاصمہ خالی خالی نظروں سے ثاقب کو دیکھتی رہی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل کی گہرائیوں سے کسی نئے جذبے نے سر ابھارنے کی کوشش کی' لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے ابھرتے ہوئے جذبہ کو کچل کر رکھ دیا۔ ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش یکلخت روشن ہو گئے تو اس نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا۔ گردن کو بڑی آہستگی سے ذرا سی جنبش دے کر سیدھا کیا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں' لیکن کان اب بھی دروازے پر لگے ہوئے تھے اور دل تھا کہ یوں دھڑکے جا رہا تھا جیسے دروازے پر اس نے ثاقب کو نہیں بلکہ کسی ڈاکو کو دیکھا تھا جو بھری محفل میں اسے لُوٹ لینے کی تمنا دل میں چھپائے

سینہ تانے کھڑا تھا۔ سہمے سہمے جذبات میں درد کی ٹیس ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

عاصمہ آنکھیں بند کئے آنے والے لمحات کی منتظر تھی۔ اس کا ذہن بُری طرح چکرا رہا تھا' لیکن کان ایک ایک آہٹ کو سن رہے تھے۔ باہر مہمان خواتین کا شور و غل ابھی تک جاری تھا۔ نقرئی قہقہے بار بار کھنک اٹھتے اور پھر ڈھولک کی آواز پر خوشی کے نغمے ابھرنے لگتے۔ مگر وہ ان آوازوں کو ترجیح نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو صرف ان قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھی جو رفتہ رفتہ بتدریج اس کی زندگی' اس کے وجود اور اس کی بے بسی سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

"عاصمہ!" ثاقب نے اُس کے قریب آ کر آہستہ سے پکارا تو اس کا معصوم وجود کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ مبادا دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والی چیخ کہیں جھوٹی خوشیوں کا سینہ نہ چاک کر دے۔

"عاصمہ!" ثاقب نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے آواز دی۔

وہ خاموش رہی..........

"کچھ ناراض ہو مجھ سے؟" ثاقب کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔

وہ چپ بیٹھی رہی..........

"شرما رہی ہو.......... کیوں؟" ثاقب کے سانسوں کی مہک سہرے کی لڑیوں سے ٹکرا رہی تھی۔

اس نے اپنے ہونٹ بڑی سختی سے بھینچ لئے۔

"اجازت ہو تو چاند پر سے نقاب پلٹ دوں؟" ثاقب اس کے حکم کے منتظر تھے۔

اس نے اپنی گردن کچھ اور جھکا لی..........

"ارے.......... تم تو سچ مچ دلہنوں کی طرح شرما رہی ہو.........."

ثاقب نے جسارت سے کام لیا۔ آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر سرخ دوپٹہ کا حریری آنچل پلٹ دیا۔

اس کی مانگ میں بھری افشاں روشنی میں چمک اٹھی۔

"تم واقعی عاصمہ ہو۔" ثاقب نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

اس نے اپنے وجود میں سمٹ جانے کی کوشش کی۔

"آنکھیں کھولو عاصمہ! دیکھو میں کتنی دیر سے تم سے باتیں کر رہا ہوں' مگر تم چپ

بیٹھی ہو۔"

عاصمہ پھر بھی خاموش رہی۔

"حجاب مانع ہے .... کیوں؟" ثاقب نے اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ جما کر چہرہ اونچا کیا تو انہیں یوں لگا جیسے گہنائے ہوئے چاند کی تاریکی یکلخت چھٹ گئی ہو۔ چہرے کی افشاں نے اس کی معصومیت کو کس قدر تابندگی بخش دی تھی۔

کچھ دیر تک ثاقب حُسنِ مجسم کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر آہستہ سے گویا ہوئے۔

"عاصمہ! تم نہیں جانتیں کہ تمہیں پا کر آج میں کس قدر خوش ہوں۔"

عاصمہ کے یاقوتی ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

"میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھ رہا ہوں۔ جسے تم جیسی شریکِ حیات ملی ہے۔ کچھ تم بھی تو بولو۔"

عاصمہ کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے۔

"خاموشی کے اس طلسم کو توڑ دو عاصمہ!" ثاقب نے جذبات میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"آج کی رات ہماری زندگی کی سب سے خوشگوار رات ہے۔ اس رات کا ہنستے بولتے استقبال کرو۔ اس لئے کہ یہ رات کبھی پلٹ کر دوبارہ نہیں آتی۔"

عاصمہ کسی بے جان بت کی طرح ساکت و جامد تھی..........

"تمہیں میری قسم عاصمہ! آنکھیں کھولو.........."

عاصمہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے پلکوں کو ذرا سی جنبش دی۔ آنکھیں ایک لمحہ کے لئے کھولیں پھر دراز دراز پلکوں کو دوبارہ چلمن کر لیا۔

"خدا کا شکر ہے .... تم نے میری خواہش کا احترام تو کیا۔"

اور عاصمہ خود اپنے آپ پر جھلا کر رہ گئی۔ اندر ہی اندر سلگ اٹھی۔ آخر وہ کون سا جذبہ تھا جس نے اسے ثاقب کی خواہش کا احترام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیوں اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ثاقب نے کہا تھا تو کہتے رہتے۔ وہ کیوں اتنی جلدی نرم پڑ گئی تھی..........؟

"کیا مرد کا فریب اس کے آہنی ارادوں پر غالب آ گیا تھا؟" عاصمہ نے سوچا اور پھر اپنی اس معصوم حماقت پر تلملا اٹھی۔

"عاصمہ کچھ باتیں کرو۔"

جواب میں عاصمہ کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ کے علاوہ کچھ بھی نہ نکلا۔ وقت جوں جوں گزرتا گیا ثاقب کی بے چینی بڑھتی گئی۔ جذبات کی شدت نے اسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے طور پر سوچ رہا تھا کہ عاصمہ شرما رہی ہے۔ اس لئے وہ اب قدرے بے باک ہونے لگا تھا۔

خواب گاہ کے برقی قمقمے ایک ایک کر کے بجھ گئے تھے اور اب صرف ایک ہلکے پاور کے نیلے رنگ کے بلب کی خوابناک سی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا یہ رات یوں ہی گزر جائے گی؟" ثاقب نے عاصمہ کے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔ پھر اس کا حنائی ہاتھ تھام کر آہستہ سے دبا دیا۔ "کچھ تو بولو عاصمہ!"

اور ثاقب کے ہاتھوں کے لمس نے عاصمہ کے وجود کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم پر بے شمار چیونٹیوں نے اچانک یلغار کر دی ہو۔ افشاں سے چمکتی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا اٹھے تھے۔ ہونٹ آپ ہی آپ کپکپائے جا رہے تھے اور اسے سینے میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس ماحول سے اٹھ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں سے اس کے آہنی ارادوں کو متزلزل کرنے والا کوئی نہ ہو' لیکن وہ مجبور تھی۔ ماں کی خوشیوں نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ بھائی کے تابناک مستقبل نے اسے مجبور و بے بس کر دیا تھا..........

ثاقب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا..........

"آج ان دوریوں کو ختم ہو جانے دو میری زندگی جس نے آج تک مجھے تڑپایا ہے۔ تم کیا جانو کہ تمہیں پا لینے کی تمنا میں مَیں نے کتنے حسین خواب دیکھے ہیں اور آج تم میرے انہی خوابوں کی تعبیر بنی میرے سامنے بیٹھی ہو۔ میری روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھو میری عاصمہ! تمہیں وہاں محبت کے خزینے دفن نظر آئیں گے۔"

اور عاصمہ بت بنی بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کیا وہ اتنی آسانی سے ایک مرد کی حسین باتوں کے فریب میں آ جائے گی۔ کیا وہ بھی شبانہ بیگم کی طرح آنکھ بند کر کے ایک مرد کے سحر کار جملوں میں الجھ کر گرفتار ہو جائے گی۔ کیا وہ بھی ناہید کی طرح دولت کی چمک دمک کے آگے نسوانیت کی عظمت کو سرنگوں کر دے گی..........؟

"نہیں .... نہیں .... نہیں۔" اس کی روح کی چیخ اس کے وجود سے ٹکرا

کر پاش پاش ہو گئی۔ ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے' پھر سہم کر دوبارہ بند ہو گئے۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

دل کی دھڑکن پر صرف ایک سوال مختلف انداز سے مچل رہا تھا۔

یہ سب کیوں ہے ....؟

کیا ہو رہا ہے ....؟

کیا ہونے والا ہے ....؟

دوسری طرف ثاقب کی آنکھوں میں خمار آلود رنگینیاں رقص کر رہی تھیں۔ اس کے جذبات میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ عاصمہ کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لئے وہ آنے والے خوشگوار مستقبل کے بارے سوچ رہا تھا۔

مستقبل ....

جسے اس نے عاصمہ کی طرح روشن اور تابناک محسوس کیا تھا..........

جس کے خواب وہ ایک طویل عرصے سے دیکھ رہا تھا..........

جذبات کو تھپکیاں دے دے کر بہلاتا رہا تھا..........

دل میں مچلتے ارمانوں کو حسین بہلاوے دیتا رہا تھا..........

آج وہ مستقبل' حال کے دامن میں سمٹا سمٹایا اس کے سامنے موجود تھا..........

ایک عورت کے روپ میں جسے اس نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہا تھا..........

ایک دلہن کے روپ میں .... جو اس کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی..........

خوشی کے نشے میں سرشار وہ بہک جانے کے لئے کس قدر مضطرب مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔

"عاصمہ..........!" اس نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے آنکھیں کھولو' میں تمہارے حسن کی کشادہ آغوش میں اپنے عشق کو آسودگی دینے کا منتظر ہوں۔"

عاصمہ بدستور ساکت رہی تو اس نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ بڑے دلآویز انداز میں مسکرا کر بولا۔

"میرا ارادہ ہے کہ کچھ دنوں کے لئے دفتر سے چھٹی لے لوں۔ پھر ہم کسی پہاڑی مقام پر چل کر ہنی مون منائیں گے۔ جہاں میں ہوں گا.......... تم ہو گی اور.........."

"ثاقب.........." عاصمہ کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز بلند ہوئی' لیکن اس

سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی........

"کہو' کیا کہتے کہتے رک گئی تھیں تم.........."

"مم.......... میں.........."

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" ثاقب مسکرایا۔ "دل گھبرا رہا ہے شاید..........؟"

"ہاں.........." وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"کیا میری محبت پر اعتماد نہیں ہے؟"

وہ خاموش رہی۔ کیسے کہہ دیتی کہ وہ صرف اسی سے کیا دنیا کے تمام مردوں سے نفرت کرتی ہے۔ پھر اعتماد کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے' لیکن شرم و حیا نے اس کی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے۔

"عاصمہ! آج سے ہم دونوں مل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔"

"ہاں.........." وہ دل پر قابو پا کر بولی۔

"تم تمام زندگی میرا ساتھ دو گی نا!"

"جی.........." اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میں واقعی کتنا خوش نصیب ہوں عاصمہ!"

وہ خاموش رہی' لیکن اب وہ گھبرا نہیں رہی تھی۔ کسی ٹھہرے ہوئے طوفان کی طرح مطمئن تھی۔

"آنکھیں تو کھولو۔" ثاقب نے ضد کی تو اس نے کچھ سوچ کر اور دل پر جبر کر کے خواہش کی تکمیل کر دی۔

"میری طرف دیکھو۔"

وہ ایک لمحے کے لئے جھجکی پھر ثاقب کی طرف دیکھا تو دل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ ارمانوں کے کتنے ہی ساغر اسے ثاقب کی آنکھوں میں چھلکتے نظر آئے تھے۔ گھبرا کر اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"ایک تم ہی کیا.......... آج کی رات تو ہر لڑکی یونہی شرماتی ہے۔"

"ثاقب.........." عاصمہ نے بڑی ہمت کر کے آہستگی سے کہا۔ "کیا ہم دوست بن کر زندگی نہیں گزار سکتے؟"

"کیوں نہیں............" ثاقب خوشی سے سرشار ہو کر بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے مخلص دوست بنے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن سی ہو گئی' لیکن یہ اطمینان بھی دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ثاقب نے اس کے جملے کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ شوخ لہجے میں بولا۔

"دوستوں کے درمیان اتنے فاصلے کبھی نہیں ہوتے۔"

"جی............" اس نے سہم کر ثاقب کو دیکھا۔

"میں ان دوریوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں عاصمہ! جو ہمارے درمیان اب تک برقرار ہیں۔" ثاقب کی نظروں میں جذبات مچل رہے تھے۔

"میں سمجھی نہیں............"

"کوشش کرو۔" وہ مسکرا دیا............

عاصمہ نے اس کی بات کا مطلب سمجھا تو گردن جھکالی۔ پھر اس وقت وہ ساری جان سے لرز اٹھی تھی' جب ثاقب نے بڑی بے تکلفی سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔

"جان بوجھ کر انجان نہ بنو میری روح! شادی ایک اہم ضرورت کا نام ہے۔"

اور پھر عاصمہ مجبور ہو کر رہ گئی۔ اس نے حقارت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نفرت سے منہ پھیرلیا۔ روح چیخ چیخ اٹھی' لیکن اپنی مجبوری اور بے بسی پر آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

خواب گاہ میں گہری تاریکی مسلط تھی۔ گھپ اندھیرا اس کی بے کسی پر چھایا جا رہا تھا۔ ثاقب کی سانس کی آواز اس کے وجود کو کچوکے لگا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خاموشی سے اٹھ کر سوتے میں اس کا گلا گھونٹ دے جس نے اُس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کی نسوانیت کو روند ڈالا تھا۔ اُس کے جذبات کو کچل دیا تھا اور اب کتنے سکون سے پڑا آرام کی نیند سو رہا تھا۔

خودغرض............

فریبی............

وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ اندھیرے کے لہراتے ہوئے سایوں سے اسے ہول سا اُٹھ رہا تھا۔ تاریکی اسے نگل لینے کے درپے تھی۔ دل کی دھڑکنیں کسی طرح تھمتی نظر نہیں

آ رہی تھیں۔ آنکھوں سے شبنمی قطرے ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے اور وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اندر کی عورت کو تلاش کر رہی تھی۔

عورت............

جو اندھیرے ہی میں لوٹ لی گئی تھی............

جس کا عزم ایک مرد کے آہنی ارادوں سے ٹکرا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا............

جو مجبوریوں کا شکار ہو کر تڑپ اٹھی تھی............

سسک رہی تھی............ بلک رہی تھی' لیکن اس کے آنسو خشک کرنے والا کوئی نہ تھا............

عاصمہ بہت دیر تک یوں ہی آنسو بہاتی رہی۔ اپنی بے بسی پر تلملاتی رہی۔ ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر جب ذہن تھک کر نڈھال ہو گیا تو نیند نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆======☆======☆

عارف علی نے ناہید کو طلاق دینے کے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعے کارروائی مکمل کرا دی اور ناہید کو مہر کی رقم بھی ادا کر دی گئی۔

ناہید سے چھٹکارا حاصل کر لینے کے بعد عارف علی کو کچھ سکون ضرور ہوا تھا لیکن اب انہیں شبانہ بیگم اور بچوں کی یاد زیادہ شدت سے ستانے لگی تھی۔ ناہید کے قدم گھر سے باہر نکلتے ہی انہوں نے قصرِ ناہید کی تختی ہٹوا کر دوبارہ قصرِ شبانہ کی تختی لگوا دی۔ ہرچند کہ یہ رد و بدل ان کی خوشیوں کو دوبارہ واپس نہیں لا سکتی تھی لیکن عارف علی اب اس مکان پر ناہید کے نام کی پرچھائیں بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وقت نے ان کے احساسات پر جو چرکے لگائے تھے اور قسمت نے ان کے ساتھ جو کھیل کھیلا تھا اس نے عارف علی کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا اور لاغر کر دیا تھا۔

عارف علی کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ آج بھی اگر چاہتے تو ناہید کی جگہ کوئی اور عورت بیاہ کر لا سکتے تھے' لیکن اب ان کے دل کے سارے ولولے اور سارے حوصلے مر چکے تھے' احساسِ ندامت اور ناہید کی بے وفائی نے انہیں چونکا دیا تھا۔ اس نشے کی ساری کیفیت ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو گئی تھی جو ناہید کے حُسن و جوانی نے ان پر مسلط

کر رکھی تھی۔ مکرو فریب کا پردہ چاک ہوا تو حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آ گئی۔ ماضی کے نقوش جو ناہید کی حُسن کے سحرکاریوں نے دھندلا دیئے تھے۔ دوبارہ اجاگر ہوئے تو عارف علی ماہئ بے آب کی طرح تڑپ اٹھے۔

تمام دن وہ کاروباری مصروفیات میں الجھے رہتے' لیکن رات کو جب وہ تھکے ہارے اپنے بستر پر جاتے تو ذہن جاگ اٹھتا۔ وہ سوچتے انہوں نے شبانہ بیگم کے ساتھ جو ظلم کیا ہے اس کا تدارک کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ شبانہ بیگم کی وفاشعاری کو یاد کر کے تمام تمام رات پلکوں کے نیچے سے گزار دیتے۔ کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ کبھی وہ سوچتے ایک بار پھر عہد رفتہ کے دروازوں پر جا کر اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو آواز دیں' لیکن عاصمہ کا خیال آتا تو تڑپ جاتے۔ عاصمہ ان کی اولاد تھی' لیکن اس نے بچھڑے ہوئے باپ کو دروازے پر سوالی بنا دیکھ کر بھی کس قدر نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ یوں جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی رشتہ نہ تھا۔ کیسی کیسی تلخ باتیں کی تھیں اس نے جن کا زخم آج بھی عارف علی کے دل پر موجود تھا۔ مگر انہوں نے عاصمہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا تھا۔ وہ حق بجانب تھی۔ قصور دو ان کا اپنا تھا انہوں نے بھی محض ناہید کی جوانی کی چمک دمک کی خاطر شبانہ بیگم کی بے لوث وفاؤں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس وقت ان کو بھی تو عاصمہ کی معصوم نگاہوں پر کوئی ترس نہ آیا تھا جب اس نے ماں کے سینے سے لگ کر آخری بار معصوم نظروں سے باپ کو دیکھا تھا۔

کتنی التجا تھی کتنی بے چارگی تھی ان معصوم نگاہوں میں........... بے بسی جھلک رہی تھی...........

جیسے اس کی بے زبانی بھی زبان بن کر باپ سے رحم کی طلبگار تھی۔

لیکن...........

لیکن عارف علی نے کتنی بے مروتی سے نظریں پھیر لی تھیں...........

شبانہ بیگم کی طرف سے جنھوں نے ہمیشہ انہیں اپنا مجازی خدا سمجھا تھا...........

عاصمہ کی طرف سے جو ابھی معصوم تھی...........

ایک ننھی سی کلی جس نے زندگی میں بہاروں کا مطلب بھی ابھی نہیں سمجھا تھا...........

سہمی سہمی نظروں سے وہ باپ کو گھور رہی تھی...........

کتنی التجا تھی ان پیاری پیاری نظروں میں...........

مگر...........

بیوی کی وفاؤں اور بیٹی کی معصوم التجاؤں کے درمیان ایک اور قوت آ گئی تھی۔

اور اس قوت کا نام ناہید تھا۔

ناہید...........

جو جوان تھی........... حسین تھی...........

جس کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے ساغر عارف علی کو مدہوش کر گئے تھے۔

جس کی جوانی کی خمار آلود انگڑائیوں نے عارف علی کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے...........

جس کی توبہ شکن اداؤں نے انہیں اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور وہ آنکھیں بند کر کے ناہید کی مست نظروں میں ڈوب گئے تھے...........

عارف علی کو معاشرے میں اپنا نام بلند کرنے کے لئے ایک حسین سہارے کی ضرورت تھی........... اور...........

یہ سودا کاروباری اصولوں پر طے ہو گیا...........

محبت نے بیوپار کی شکل اختیار کر لی...........

لیکن...........

آج جب عارف علی کو اس بیوپار میں اپنے خسارے کا احساس ہوا تو وہ نڈھال ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے دولت کے بل بوتے پر ناہید کی جوانی کو خرید لیا تھا' لیکن دولت سے اپنی خوشیاں خریدنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ رات کی تنہائیوں میں انہیں شبانہ بیگم کی وفاؤں کی یاد آتی تو وہ بے چین ہو کر رہ جاتے۔ عاصمہ کی تلخ کلامی پر غور کرتے تو احساسِ ندامت سے سر جھک کر رہ جاتا اور آصف کو یاد کرتے تو دل کی گہرائیوں سے ایک سرد آہ اُبھر کر ان کے کپکپاتے لبوں پر تڑپ جاتی۔ کتنی حسرتیں دل میں چھپائے وہ شبانہ سے اپنے گناہوں کے اعتراف کی خاطر اس کی چوکھٹ تک گئے تھے' لیکن عاصمہ نے انہیں ایک بھکاری کی طرح دھتکار دیا تھا۔ پھر وہ آصف سے ملے مگر آصف نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ ماں اور بہن کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ زندگی کی خوشیوں نے کتنی جلدی منہ موڑ لیا تھا۔

اور پھر ناہید بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ آج عارف علی کو بڑی شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ دولت دنیا میں سب کچھ خرید سکتی ہے لیکن قلب کا سکون فراہم کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ انہیں ناہید سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس لئے کہ ناہید ایک آزاد پنچھی کی طرح زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ عارف علی نے اس کے پر کاٹ کر سنہری پنجروں میں قید کرنا چاہا لیکن اس کی قوتِ پرواز کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا' عارف علی نے غموں کی شدت سے چھٹکارا پانے کے لئے شراب کا سہارا تلاش کر لیا' لیکن یہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوا۔ جب تک شراب کا نشہ طاری رہتا ذہن پر دھند چھائی رہتی لیکن جب خمار کا سحر ٹوٹتا تو تکلیف کا احساس پہلے سے دوچند ہو جاتا۔ وہ کلب کے ہنگاموں میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو ماحول کی رنگینیاں ان کا منہ چڑاتی نظر آتیں۔ گھر میں پناہ لینے جاتے تو قصرِ شبانہ کے در و دیوار ان پر لعن طعن کرتے نظر آتے............

ہر طرف بے بسی کا احساس مسلط تھا............

ہر سمت وحشت طاری تھی............

اور اس وحشت اور بے بسی کے احساس نے عارف علی کو بزنس کی طرف سے بھی لاپرواہ کر دیا۔ خسارہ ہوا تو انہیں کوئی صدمہ نہ ہوا۔ زندگی تو نام ہی ہے ایک ایسے کاروبار کا جہاں نقصان اور فائدہ دونوں ہوتا ہے اور پھر عارف علی نے تو اپنی زندگی کو ایک نئے داؤ پر لگا دیا تھا۔ وقتی سکون کی خاطر انہوں نے زیادہ تر وقت بڑے بڑے کلبوں اور شراب خانوں میں گزارنا شروع کر دیا تھا۔

آج بھی وہ شہر کے ایک بڑے کلب میں موجود تھے۔ جہاں ہر طرف رونق ہی رونق تھی' نقرئی قہقہے گونج رہے تھے' رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے' فضا پر کیف و سرور کے بادل چھائے ہوئے تھے' شراب اور شباب کی ہم آہنگی نے ماحول پر کچھ عجیب سا نشہ طاری کر رکھا تھا لیکن عارف علی ان رنگینیوں سے بے نیاز اپنی میز پر بیٹھے خود کو ساغر و مینا میں غرق کر رہے تھے۔ انہیں ان ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان لہراتے ہوئے آنچلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کھنکتے ہوئے بہکے ہوئے قہقہوں سے کوئی غرض کوئی نسبت نہ تھی۔
اِنہی ہنگاموں نے تو ان کے سکون کو برباد کر دیا تھا۔

یہی لہراتے ہوئے آنچل تو تھے جن کی رنگینیوں میں گم ہو کر انہوں نے شبانہ بیگم کی وفاؤں کو ٹھکرا کر ناہید کی جوانی کو خرید لیا تھا۔

اسی ماحول نے تو معصوم عاصمہ کو ان کی طرف سے بدظن کیا تھا۔

یہی رونقیں تو تھیں جو آصف کو ان سے چھین کر دور لے گئی تھیں۔

اور ....

پھر انہی ہنگاموں میں ناہید بھی تو گم ہو کر ان سے بچھڑ گئی تھی۔

چوتھا پیگ حلق کے نیچے اترا تو ذہن پر چھانے والا نشہ گہرے دھند کی صورت اختیار کرنے لگا۔ ہر طرف جیسے کہر کی دبیز چادر لہرانے لگی۔ آرکسٹرا کی آواز صدائے بازگشت بن کر ان کے ڈوبتے ہوئے ذہن سے ٹکرا رہی تھی۔ ہونٹوں کے درمیان پائپ دبائے بیٹھے وہ دھواں اُڑانے میں مصروف تھے کہ اچانک مانوس سی آواز سن کر چونک اٹھے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے نظریں گھما کر دیکھا تو ناہید اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ بائیں جانب والی میز پر نظر آئی۔ آسمانی رنگ کی ساڑھی اور بلاؤز میں سے اس کا دمکتا ہوا جسم کس قدر حسین لگ رہا تھا۔ چہرے پر آج بھی وہی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جس کے سحر میں پھنس کر عارف علی نے اپنے سکون کو برباد کر لیا تھا۔ اس کے ہونٹ پر گہری لپ اسٹک کی تہیں آج بھی موجود تھیں۔ جو عارف علی کے ارمانوں کا خون بن کر ان کا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔

کہر کی دبیز چادر آہستہ سے سرک گئی تو عارف کا چہرہ خون کی گردش سے تمتما اٹھا۔ وہ قہر آلود نظروں سے ناہید کو گھورنے لگے جو آج پرنس اکبر کے بجائے کسی اور کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ دونوں نشے میں تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ عارف علی ناہید کو گھورتے رہے۔ نفرت بھری نظروں سے لیکن ناہید ان کی موجودگی سے بے نیاز اپنے نئے ساتھی کے ساتھ ہنس ہنس کر یوں باتیں کر رہی تھی جیسے وہ اسے بہت عرصہ سے جانتی تھی۔

بیرا ان کی میز پر شراب کے برتن سجا کر دور ہوا تو مرد نے مسکرا کر کہا۔

"یہاں سے اٹھنے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"رات زیادہ ہو گئی ہے' میں سیدھی گھر جاؤں گی۔" ناہید نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے آج چاند کی کیا تاریخ ہے؟"

"نہیں۔"

"آج چودھویں ہے۔" مرد نے اپنا گلاس بھرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"پھر.........." ناہید نے اسے مسکرا کر گھورا۔

"میں بوٹنگ کا پروگرام بنانے کی سوچ رہا تھا۔"

"روبی یا فریدہ کو ساتھ لے جاؤ۔" ناہید بولی۔ "وہ دونوں تو تمہارے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔"

"میرے نہیں بلکہ میرے پرس سے جھانکتے ہوئے سبز و گلابی نوٹوں کے اشارے ان دونوں کو زیادہ مرغوب ہیں۔"

"میرے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری؟" ناہید نے مرد کی نگاہوں میں جھانکا۔

"تم ان سب سے گریٹ ہو۔"

"منہ دیکھے کی باتیں کر رہے ہو۔ ممکن ہے روبی اور فریدہ کی موجودگی میں تم نے میرے لئے بھی کوئی بری رائے کا اظہار کیا ہو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو ناہید!" مرد نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "فریدہ اور روبی تو محض وقت گزاری کا ذریعہ ہیں۔"

"اور میں؟"

"تم.........." مرد نے بڑی بے تکلفی سے ناہید کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم میرے لئے کہکشاں ہو۔"

"زیادہ چڑھ گئی ہے شاید۔"

"نہیں، میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔"

"کہکشاں زمین پر نہیں آسمان پر ہوتی ہے۔"

"تم آسمان کی بلندیوں سے بھی زیادہ عظیم تر ہو۔" مرد بولا۔ "فریدہ اور روبی تمہارے سامنے ہیچ ہیں۔"

مرد نے تیسرا پیگ تیار کرنے کے لئے بوتل اٹھائی تو ناہید نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیوں..........؟"

"بس .... تم پہلے ہی بہت زیادہ پی چکے ہو۔"

"بہت زیادہ خیال ہے تمہیں میرا۔"

"صرف اس وقت تک جب تک تم میرے ساتھ ہو۔"

"کیا مطلب .... کیا تم میرا ساتھ چھوڑ دو گی؟"

"ہاں .... کلب سے باہر نکلنے کے بعد ہمارے راستے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے۔"

"کیا یہ راستے ہمیشہ کے لئے ایک نہیں ہو سکتے؟" مرد نے چڑھی چڑھی نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں .... یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں..........؟"

"میں یکسانیت سے گھبراتی ہوں۔"

"میں کچھ اور سمجھا تھا۔"

"کیا..........؟" ناہید نے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ پرنس اکبر آج کل شہر میں نہیں ہے۔" مرد نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ "بزنس کی وجہ سے ہفتہ دو ہفتہ کے لئے باہر گیا ہوا ہے۔"

"تم نے اس وقت پرنس کا ذکر کیوں نکالا ہے؟"

"کیوں .... ناگوار لگ رہا ہے تمہیں۔"

"نہیں .... لیکن میں ایک وقت میں صرف ایک ذکر سننا زیادہ پسند کرتی ہوں۔"

"میں پرنس اکبر جیسے بزنس مین کو خریدنے کی ہمت بھی رکھتا ہوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" ناہید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہی کہ زندگی صرف پرنس کے بازوؤں کے حلقے تک محدود نہیں ہے۔ کبھی اس سے باہر نکل کر بھی دیکھو۔ زندگی تم کو زیادہ حسین نظر آئے گی۔"

"مسٹر شہباز! تم فضول باتیں کر رہے ہو۔"

"فضول باتیں۔" مرد کا قہقہہ گونج اٹھا۔ پھر یکلخت وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں پرنس سے زیادہ اثر و رسوخ والا اور دولت مند ہوں۔"

"ٹھیک ہے لیکن............"

"میں تمہیں اس کی نسبت زیادہ دولت دے سکتا ہوں۔" شہباز کاروباری انداز میں بولا۔

"ہو سکتا ہے لیکن تمہیں یہ سن کر مایوسی ہو گی کہ میں عنقریب پرنس اکبر سے شادی کرنے والی ہوں۔"

"پرنس اور شادی!" شہباز نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ "تم سے پہلے بھی وہ بے شمار لڑکیوں کو یہی بہلاوے دے چکا ہے۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" ناہید نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"محض دوستی۔" شہباز بولا۔ "شادی کا دھوکہ دے کر میں تم کو کسی فریب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیا تم مجھے بازاری عورت تصور کرتے ہو؟" ناہید نے تیزی سے کہا۔

"نہیں .... لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے عارف علی کو کس کے بہکاوے میں آ کر چھوڑا ہے۔"

"وہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔"

"میری پیشکش بھی تمہارا ذاتی معاملہ بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ تم عقلمندی سے کام لو۔"

"کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے۔" ناہید کچھ توقف کے بعد بولی۔

"سوری ڈیئر!" شہباز بڑی صاف گوئی سے بولا۔ "میں زندگی کو بھی ہمیشہ کاروباری اصولوں پر پرکھنے کا عادی ہوں .... اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے .... والی بات زیادہ بہتر ہو گی۔"

"کچھ دیر پہلے تم پرنس سے برابری کا دعویٰ کر رہے تھے۔"

"ہاں، میں اس کے مقابلے میں تم کو زیادہ دولت دے سکتا ہوں لیکن شادی کے بکھیڑوں میں الجھ کر مہر کی ادائیگی کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔"

"شہباز!" ناہید تلملا اٹھی۔ "تم میری توہین کر رہے ہو۔"

"کاروبار میں توہین کا خیال کرنا حماقت ہے۔ میں سودے بازی کو زیادہ ترجیح دینے کا قائل ہوں۔"

"تم نے مہر کی بات کیوں کہی تھی؟" ناہید نے غصے سے پوچھا۔

"اس لئے کہ عارف علی نے تم کو ایک بھاری رقم ادا کی ہے جبکہ............"

"شٹ اپ.........." ناہید کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"یہی جملہ تم نے پرنس کی خاطر عارف علی سے بھی کہا تھا، لیکن میں عورت کو عزت سے زیادہ پوجنے کا عادی نہیں ہوں۔" شہباز نے گلاس بھرتے ہوئے قدرے نفرت سے کہا۔

ناہید اپنی جگہ بیٹھی پیچ و تاب کھاتی رہی۔

"فی الحال میں تم کو مجبور نہیں کروں گا۔" شہباز نصف گلاس خالی کر کے بولا۔ "لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ پرنس کچھ دنوں تک تم سے کھیل کر کسی نئی تتلی میں الجھ جائے گا۔"

"میں تم سے اپنی زندگی کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں چاہتی۔"

"کچھ دنوں کی بات اور ہے، موسم اور جوانی دونوں بدلتے رہتے ہیں .... آج تم بہار کا سرچشمہ بن کر ابل رہی ہو لیکن کل............"

"تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔" ناہید بل کھا کر بولی۔

"وقت کی قیمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرو مائی ڈیئر!" شہباز سپاٹ آواز میں بولا۔ "جوانی ڈھلتی چھاؤں کی طرح ہے۔ کل کی فکر کرنے والے آج کی مسرتوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔"

ناہید نے اٹھ جانا چاہا تو شہباز نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا بوٹنگ کا ارادہ نہیں ہے۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ دو شہباز!" ناہید غرائی۔ "میں فریدہ یا روبی نہیں ہوں۔"

"میں صرف آج کی رات کے لئے تم کو دس ہزار کی آفر کرتا ہوں۔" شہباز کا لہجہ خالص کاروباری تھا۔

"بکو مت، میں طوائف نہیں بلکہ عورت ہوں۔"

"عورت.........." شہباز نے شراب کا گھونٹ لے کر کہا۔ "طوائف بھی عورت ہی ہوتی ہے مائی ڈیئر! اور پھر، تم نے تو پرنس کی خاطر عارف علی کو بھی چھوڑ دیا۔ جو تمہارا جائز شوہر تھا۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ کر بات کرو۔" ناہید نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ چہرہ خون کی

سرخی سے تپ اٹھا۔ زخم خوردہ ناگن کی طرح وہ شہباز کو حقارت سے گھور رہی تھی۔

"تمہاری مرضی .... مگر ایک بار پھر سوچ لو .... کل تمہاری قیمت روبی اور فریدہ سے بھی کم ہو جائے گی۔"

ناہید کے ذہن میں طوفان ابھر آیا۔ حُسن کے زعم میں وہ آپے سے باہر ہو گئی گھما کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس نے شہباز کے گال پر رسید کیا۔ پھر بل کھاتی وہاں سے چلی گئی۔

عارف علی کا ابھرنے والا قہقہہ بڑا زخمی ثابت ہوا۔ ایک دن ایسا ہی خاموش تھپڑ ناہید نے ان کی زندگی پر مارا تھا۔

تھپڑ..........

جس نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

اور آج اسی ناہید نے دوسرا تھپڑ ایک اور مرد کے منہ پر مارا تھا۔ زناٹے دار اور بھرپور تھپڑ' جس نے ایک اور مرد کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔

قہقہہ لگاتے ہوئے عارف علی میز سے اٹھے تو ان کی کہنی گلاس سے ٹکرا گئی اور شیشہ سنگلاخ زمین سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے انہوں نے شیشے کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھا پھر انہیں پاؤں تلے روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

☆======☆======☆

عاصمہ کی شادی نے شبانہ بیگم کے ذہن کا بوجھ قدرے ہلکا کر دیا تھا مگر وقت نے ان کی زندگی کو جو روگ بخشا تھا وہ بدستور رِستے ہوئے ناسور کی شکل میں ان کے دل میں پرورش پا رہا تھا' اور اب تو تنہائی نے اس زخم کو اور بھی کرید کر رکھ دیا تھا۔ عاصمہ ان کے خیال سے اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ آصف صبح دفتر چلا جاتا۔ شام کو واپس آتا تو چائے پی کر پڑھائی میں مصروف ہو جاتا۔ شبانہ بیگم تنہائی میں بیٹھی گزرے دنوں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتیں۔

آصف کے اصرار پر انہوں نے اپنا علاج قطعی طور پر بند تو نہیں کیا تھا۔ اولاد کی دل جمعی کے لئے اس کے سامنے یوں ہنستی بولتی رہتیں جیسے مرض گھٹتا جا رہا ہے' لیکن اپنی حالت کو وہ خود بہتر طور پر سمجھ رہی تھیں۔ درد گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ غموں کے بوجھ نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ اندر ہی اندر شوہر کی جدائی کا غم انہیں جیسے کھوکھلا کئے دے رہا تھا۔ جب تک عاصمہ اور آصف تھے وہ اس قدر نڈھال نڈھال اور اداس اداس کبھی نہ رہتی تھی لیکن اب تو ہر وقت ہی گزرے دنوں کی حسین یادوں میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھیں۔

انہیں اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ عارف علی نے ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ زندہ ہے یا مر گئی۔ پھر جس روز عاصمہ کا ڈولا اٹھا تھا اس روز تو وہ تمام رات آنسو بہاتی رہیں۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی اولاد کے سر پر ہاتھ پھیرنے والا کوئی نہ تھا۔ دل پر جبر کر کے اور سینے پر پتھر کی سِل رکھ کر انہوں نے اس فرض کو پورا کیا تھا۔ مگر فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی زندگی کے کچھ پچھتاوے باقی رہ گئے تھے۔ وہ کمرے میں پڑی پڑی سوچا کرتیں۔

آخر یہ کیسے رشتے تھے جو جڑے رہنے کے بعد بھی ٹوٹے ٹوٹے نظر آ رہے تھے۔

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے غافل تھے' آخر کیوں؟

قصور اگر تھا تو شبانہ بیگم کا تھا جو وہ خود کو مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھال کر شوہر کے دوش بدوش زندگی کی شاہراہوں پر قہقہے نہ بکھیر سکیں۔

ستر پوشی کو ٹھکرا کر عریانیت کو اپنانے سے گریز کرتی رہیں .... اور

شوہر کی خدمت کرتے کرتے وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئیں..........

انہوں نے حُسن کو کبھی میک اَپ سے جلا نہ بخشی..........

کبھی جدید فیشن کو اپنا کر ڈھلتی عمر کو جوانی کا خول نہیں پہنایا..........

لیکن ....

عاصمہ کا کیا قصور تھا..........؟

ماں کے ناکردہ گناہوں کی سزا اس کی بیٹی کو کیوں ملی..........؟

وہ دلہن بن کر ماں کی آغوش سونی کر گئی لیکن باپ نے پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ دلہن بن کر کیسی لگی تھی ....؟ اسے کیا جہیز دیا گیا؟

رخصتی کے وقت وہ کیسا پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور پھر آصف تو لڑکا تھا..........

اسے تو ماں سے زیادہ باپ کی رہبری کی ضرورت تھی..........

شبانہ بیگم رو رو کر نڈھال ہو جاتیں تو کچھ دیر کے لئے انہیں قرار آ جاتا' لیکن پھر آصف ان کے سامنے آتا تو غم تازہ ہو جاتے۔ عاصمہ کبھی ماں کی خیریت پوچھنے کے لئے دو گھڑی کے لئے آ جاتی تو شبانہ بیگم جلدی سے آنسو پونچھ کر مسکراتی نظروں سے اسے خوش آمدید کہتیں' مگر جب وہ چلی جاتی تو دل کے چھالے پھوٹ کر آنکھوں کے راستے بہہ نکلتے اور ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتیں کہ کیا زندگی کا شیرازہ ہمیشہ یونہی بکھرا بکھرا رہے گا؟ کیا خون کے یہ رشتے کبھی یکجا نہ ہو سکیں گے؟ کیا زندگی یونہی آنسو بہاتے ہی گزر جائے گی۔ اور کبھی جب درد صبر کی حدود سے تجاوز کر جاتا تو وہ اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔ خدا سے گڑگڑا کر رحم کی طلبگار ہوتیں۔ مگر جب آصف کا خیال آتا تو ممتاز زندہ ہونے کے لئے بے چین ہو جاتی۔ جلدی سے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے آنچل پھیلا کر ڈبڈبائی نظروں سے آسمان کو دیکھ کر کہتیں۔

"میرے معبود! مجھے اتنی زندگی اور دے دے کہ میں آصف کے سر پر سہرا دیکھ لوں۔ اسے ابھی میری ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو ختم نہ کر دینا میرے مالک! صرف زندگی کو اتنی مہلت اور عطا کر دے کہ میں اپنے بچے کو کسی قابل کر دوں اُس کے بعد میں

خوشی سے تیرے حضور میں آ جاؤں گی۔"

بڑی دیر تک وہ خدا کے سامنے سر بسجود اپنے قادرِ مطلق سے زندگی کی بھیک مانگا کرتیں۔ آنکھوں سے آنسو ڈھلک ڈھلک کر دامن میں جذب ہوتے رہتے اور ممتا تڑپ تڑپ اٹھتی۔

موت اور زندگی کی اس کشمکش نے' خوشی اور غم کی اسی آنکھ مچولی نے انہیں بہت زیادہ لاغر اور نحیف کر دیا تھا۔ کبھی پاس پڑوس کی کوئی عورت آ جاتی تو وہ دو گھڑی اپنا غم بھول کر باتوں میں مشغول ہو جاتیں۔

آج بھی وہ پڑوس کی ایک ہمدرد خاتون سے باتوں میں مصروف تھیں کہ آصف نے باہر سے آواز دی۔ اٹھ کر باہر آئیں تو آصف نے لپک کر انہیں پوری قوت سے لپٹا لیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی چمک دیکھ کر ہی شبانہ بیگم سمجھ گئی تھیں کہ وہ کوئی خوشخبری سنانے والا ہے۔ دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹا!"

"امی جان! آج میں بہت خوش ہوں۔"

"مجھے بھی بتاؤ بیٹا کہ خوشی کی کیا بات ہے؟"

"امی جان!" آصف مسرور آواز میں بولا۔ "میری ترقی ہو گئی۔"

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" شبانہ بیگم نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اور ممتا کی خوشی آنسو بن کر آنکھوں سے چھلک پڑی۔

"ارے .... آپ رو رہی ہیں۔" آصف نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں میرے لعل!" شبانہ بیگم جلدی سے آنسو پونچھ کر بولیں۔ "ورنہ تمہاری خوشی کی خبر سن کر میں آبدیدہ کیسے ہو سکتی ہوں۔"

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے ترقی کیا ملی ہے؟"

"میرے لئے یہی خوشی کیا کم ہے کہ تم ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے ہو۔"

"وہ اور بات ہے' لیکن آج مجھے بے حد مسرت ہے۔" آصف بولا۔ "امی جان! اب آپ کا بیٹا آفیسر بن گیا ہے۔"

"آفیسر.........." ماں کی نظروں میں دوبارہ عقیدت کا جذبہ چھلک اٹھا۔

"ہاں امی جان! پہلی تاریخ سے مجھے لیبر آفیسر کی جگہ مل جائے گی اور تنخواہ بھی پہلے

سے ڈیڑھ گنا زیادہ ملا کرے گی۔"

"تیرا احسان ہے میرے مولا!"

"میں اب علیحدہ کمرے میں بیٹھا کروں گا' پنکھے کے نیچے' محکمے کے تمام مزدور اب مجھے جھک جھک کر سلام کیا کریں گے۔"

"خدا کا شکر ہے' جو اس نے تمہیں اس قابل بنا دیا' لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا میرے بچے .... کبھی کسی غریب کی دل شکنی نہ کرنا۔"

"میں آپ ہی کی اولاد ہوں امی جان!" آصف نے فخر سے سینہ تان کر جواب دیا۔ "دوسروں کے دکھ درد کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا' یہ میرا وعدہ ہے۔"

"لیکن یہ ترقی تمہیں اچانک کیسے مل گئی؟"

"ثاقب بھائی کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔" آصف مسکرا کر بولا۔ "بڑے آفیسر کو جب ہمارے رشتے کا علم ہوا تو اس نے ثاقب بھائی کو بلا کر اس بات کی شکایت بھی کی تھی کہ انہوں نے اب تک میری سفارش کیوں نہیں کی۔ پھر ثاقب بھائی کی موجودگی ہی میں مجھے نئے فرائض سونپے گئے ہیں۔"

"خدا ثاقب کو اس کا اجر دے گا۔" شبانہ بیگم نے دل سے دعا دی۔

"امی جان! ثاقب بھائی تو سچ مچ ہیرا ہیں۔ دفتر میں بھی میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے' آج ہی کہہ رہے تھے کہ اب میں باقاعدہ اپنی پڑھائی شروع کر دوں۔ مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ بی اے کر لینے کے بعد وہ مجھے لیبر آفیسر سے بھی اونچی کسی پوسٹ پر لگوا دیں گے۔"

"تم عاصمہ کی طرف بھی گئے تھے؟"

"جی ہاں' آپی کو بھی یہ خوشخبری سنا کر آیا ہوں۔"

"کیا خالی ہاتھ چلے گئے تھے؟"

"اوہ .... مجھے خوشی میں مٹھائی لے جانے کا خیال ہی نہ رہا۔"

"تم نے برا کیا آصف! جاؤ اب بازار سے دو سیر مٹھائی لے کر دے آؤ۔ ورنہ نسیمہ بیگم دل میں کیا خیال کریں گی۔ تم پاس ہوئے تھے تو وہ سب سے پہلے مٹھائی لے کر آئی تھیں۔"

"ابھی جاتا ہوں۔" آصف باہر جانے کے لئے گھوما تو شبانہ بیگم نے آواز دی۔

"ارے سن تو سہی' بھاگا کہاں جا رہا ہے؟"

"آپ ہی نے تو مٹھائی لے جانے کا حکم دیا تھا۔"

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" آصف نے مسکرا کر کہا تو شبانہ بیگم اس کی معصومیت پر ہنس پڑیں۔ اندر سے پیسے لا کر انہوں نے آصف کو دیئے پھر سمجھا کر کہا۔

"مٹھائی لے جا کر نسیمہ بیگم کے ہاتھ میں دینا' کہیں خوشی میں عاصمہ کو نہ دے آنا ڈبہ۔"

"جی اچھا۔"

"اور ہاں .... میری طرف سے ثاقب کو دعا کہہ دینا۔"

"بہتر ہے۔"

"نسیمہ بیگم سے کہہ دینا کہ کل میں دوپہر میں کسی وقت آؤں گی۔"

آصف گردن ہلاتا ہوا خوشی خوشی باہر چلا گیا تو شبانہ بیگم اندر آ گئیں۔ کچھ دیر تک پڑوس کی عورت سے بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ پھر جب وہ چلی گئی تو جلدی سے اٹھ کر وضو کر کے دو رکعت شکرانے کے نفل ادا کئے اور دیر تک سر سجدے میں ڈالے خدا سے آصف کے لئے دعائیں مانگتی رہیں۔ اُس کے تابناک مستقبل کی آس لگائے اپنے معبود حقیقی سے ہمکلام رہیں پھر جب آصف واپس لوٹا تو انہوں نے اٹھ کر اسے کھانا دیا۔

"امی جان! خالہ جان نے آپ کو بہت بہت مبارکباد دی ہے۔"

"ان کا احسان ہے بیٹے جو ہم لوگوں کو اس قابل سمجھتی ہیں' ورنہ کہاں ہم اور کہاں وہ۔"

"امی جان..........!" آصف یکلخت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شبانہ بیگم نے پوچھا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے آصف! رک کیوں گئے؟"

"یوں ہی دفتر کی ایک بات تھی۔" آصف سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ نہ جانے کیوں ماں کی زبان سے اپنی غربت کا حال سن کر اسے باپ کا خیال آ گیا تھا۔ اپنی رو میں شاید وہ کچھ اور بھی کہہ جاتا لیکن بہن کی نصیحت یاد آ گئی اور اس نے اپنے ارادہ ترک کر کے گردن جھکا لی۔

شبانہ بیگم غور سے بیٹے کے چہرے کو گھور رہی تھیں۔ ماں کا دل گواہی دے رہا تھا کہ

وہ ضرور کچھ چھپا رہا ہے۔ دل کی دھڑکنیں یوں ہی تو نہیں تیز ہو گئی تھیں۔ جب آصف کھانا کھا چکا تو انہوں نے پوچھا۔

"آصف! تم کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"میں اور آپ سے کوئی بات چھپاؤں گا۔" آصف نے ایک بار پھر ماں کو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن شبانہ بیگم کا اصرار بڑھتا گیا۔

آصف نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ نہ بتائے، لیکن جب شبانہ بیگم نے اپنی قسم رکھا دی تو وہ مجبور ہو کر سب کچھ کہہ گیا اور شبانہ بیگم اس کا چہرہ تکنے لگیں جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔ انہیں اپنی سماعت پر دھوکہ سا ہو رہا تھا۔ عارف علی سے یہ توقع تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ کی تھی کہ وہ خود سے دوبارہ انہیں اپنے گھر کی زینت بنا لیں گے۔ کچھ دیر تک یوں ہی خالی خالی نظروں سے آصف کو گھورتی رہیں پھر اداس لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی تھی آصف!"

"آپی نے منع کر دیا تھا۔ ورنہ ضرور بتا دیتا۔" آصف نے دبی زبان میں کہا۔

"کیا تمہارا باپ دوبارہ تم سے نہیں ملا تھا۔"

"جی نہیں، اُس روز کے بعد سے دوبارہ آمنا سامنا نہیں ہو سکا۔"

"آصف! ایک بات پوچھوں۔" شبانہ بیگم نے درد بھری آواز میں پوچھا۔ "کیا تم اپنے باپ سے ملنا جلنا پسند کرو گے؟"

"امی جان............!" آصف اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"میری مجبوریوں کا احساس مت کرو، آصف! میں تمہارا جواب سننا چاہتی ہوں۔"

"میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں امی جان!" آصف نے کہا۔ "ابا جان نے جب آپ کو گھر سے نکال دیا تو پھر ہمارا اور ان کا کیا واسطہ؟"

"ایسا مت سوچو آصف! وہ تمہارے باپ ہیں۔" شبانہ بیگم نے لرزتی آواز میں جلدی سے کہا۔ "میری بات اور ہے لیکن تم ان کی اولاد ہو۔ تمہیں باپ کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں تو خوشی سے ملو۔ میں تمہیں کبھی منع نہیں کروں گی۔"

"لیکن وہ تو............"

"نہیں آصف!" شبانہ بیگم کی وفاؤں میں آج پھر اُبال آ گیا۔ تڑپ کر بولیں۔ "خبردار! جو تم نے اپنے باپ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔"

آصف حیرت سے ماں کا منہ تکتا رہا۔ پھر گردن جھکا کر خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شبانہ بیگم دل میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو سمیٹے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ماضی کے اوراق آج پھر پلٹ کر سامنے آ گئے تھے۔ دل کا سارا درد آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ وہ بستر پر چت پڑی سوچ رہی تھیں کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کیا وہ ان زخموں کو فراموش کر دیں جو شوہر کی نفرت کی وجہ سے اُن کے سینے میں ناسور بن کر رِس رہے تھے۔ کیا ان باتوں کو درگزر کر دیں جو مہیب اور بھیانک اندھیرے کی طرح اُن کی زندگی پر مسلط ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نفرت کو بھلا دیں جس نے انہیں سینی ٹوریم کی فضا میں موت اور زندگی سے دوچار کیا تھا۔ انہیں تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا کر دیا تھا.........

کیا کوئی عورت یوں اپنی تذلیل گوارا کر سکتی ہے.........؟

کیا کوئی اپنی خوشیوں کو یوں دوسرے کے حوالے کر دے گا جس طرح انہوں نے شوہر کی خوشنودی کی خاطر کیا تھا.........؟

اپنی محبت، اپنے سکون اور اپنی تمناؤں کو چپ چاپ ایک غیر عورت کی جھولی میں ڈال کر خود اپنے گھر سے بے گھر ہو گئی تھیں.........

دربدر کی خاک چھانی تھی.........

موت کی کشمکش میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کی تمنا کی تھی.........

اپنے آنسوؤں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کر کے اولادوں کی خوشیوں کو سہارا دیا تھا۔

سہاگ کی نشانیاں بیچ بیچ کر زندگی کے دن کاٹے تھے.........

کیا وہ ان باتوں کو بھول سکتی تھیں.........؟

رات جوں جوں بھیگتی گئی شبانہ بیگم کی بے چینیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کسی کروٹ چین نہ آ رہا تھا۔ کسی پل درد نہ تھمتا تھا بلکہ آج تو جیسے ایک طویل مدت کے تمام دکھ اور درد سمٹ کر یکجا ہو گئے تھے۔ آصف کا کہا ہوا جملہ کان میں گونج رہا تھا۔

"ابا جان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کے دوبارہ خواہشمند ہیں۔"

شبانہ بیگم کا ذہن پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ درد کی شدت ہر لمحہ

بڑھتی جا رہی تھی۔ عارف علی کا چہرہ بار بار ان کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا تو وہ تڑپ کر رہ جاتیں .... اور پھر............

اچانک شبانہ بیگم کے اندر کی عورت ایک کروٹ لے کر بیدار ہو گئی۔

عورت ....

جو مشرقی تھی ....

خالص مشرقی ....

وفا کے نام پر فنا ہو جانے والی ....

شبانہ بیگم نے فیصلہ کر لیا کہ اگر عارف علی نے اُنہیں کبھی اپنے پاس آنے کا حکم بھیجا تو وہ انکار نہیں کریں گی۔ پرانی باتوں کو درگزر کر کے شوہر کے حکم کو آنکھوں سے لگا لیں گی۔ کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں کریں گی۔ اس لئے کہ عارف علی خواہ کیسے ہی تھے لیکن تھے تو اُن کے شوہر...........

شوہر........... جو مجازی خدا ہوتا ہے...........

پھر........... وہ اپنے خدا کے حکم کو بھلا کیسے ٹال سکتی تھیں...........

اور ....

اس فیصلے پر پہنچ کر جیسے شبانہ بیگم کے دل کو قرار آ گیا........... درد کی شدت یکلخت جیسے ختم ہو کر رہ گئی .... رِستے ہوئے ناسوروں پر ان کا یہ فیصلہ جیسے مرہم بن گیا تھا۔ وقت نے طویل مدت تک اُن کے ذہن کو جو چرکے لگائے تھے وہ ایک پل ہی میں حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ گئے .... اور وہ یوں نیند کی آغوش میں بے فکر ہو گئیں جیسے انہیں اب کوئی صدمہ باقی نہ رہا ہو۔

☆======☆======☆

عاصمہ نے وقتی طور پر حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گھر کی تمام ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ ملازموں کی موجودگی کے باوجود وہ ہر کام میں پیش پیش رہتی۔ نسیمہ بیگم کسی کام سے منع کرتیں تو مسکرا کر ٹال جاتی۔

کام کا تو محض ایک بہانہ تھا ورنہ اس طرح خود کو مصروف رکھ کر وہ ثاقب سے دور دور رہنا چاہتی تھی۔ نسیمہ بیگم کو ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک تمام چیزیں اپنے ہاتھ سے لے جا کر دیتی، لیکن ثاقب کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری اُس نے ملازموں کو

سونپ دی تھی۔

نسیمہ بیگم اپنی جگہ بے حد مطمئن تھیں کہ بڑی سگھڑ بہو بیاہ کر لائی ہیں۔ گھر کے ملازمین بھی خوش تھے کہ عاصمہ نے اس گھر میں قدم رکھ کر اُن کے کاموں میں اضافہ نہیں کیا بلکہ ان کا کام بھی اپنے ذمہ کر لیا تھا۔ ثاقب ہرچند کہ ابھی تک عاصمہ کو پوری طور پر سمجھ نہ پائے تھے، پھر بھی وہ اس سے ناخوش بھی نہیں تھے۔ اُنہیں اگر عاصمہ سے کوئی شکایت تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ مسکراہٹوں کا جواب ہمیشہ گردن جھکا کر دیا کرتی تھی۔ کبھی وہ اسے اپنے پاس بلاتے تو وہ برف کا تودہ بن جاتی۔ ان کی خوشیوں اور ان کے جذبات کا احترام بڑی سرد مہری سے کرتی اور ثاقب یہ سوچ کر طرح دے جاتے کہ شاید وہ ابھی خود کو نئی زندگی سے ہم آہنگ نہیں کر سکی تھی، لیکن پھر بھی اکثر وہ یہ بات سنجیدگی سے سوچتے۔

کیا عاصمہ کے اپنے کوئی جذبات نہیں ہیں؟

وہ کیوں برف کا تودہ بنی ہوئی ہے؟

کیوں وہ ان کے جذبات کا سرد مہری سے خیر مقدم کرتی ہے؟

ٹھنڈے گوشت کی طرح جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ ہو...........!

اور دوسری طرف جب بھی ثاقب اپنے جذبات کی آسودگی کا مظاہرہ کر چکتے تو عاصمہ کا دل نفرت سے لبریز ہو جاتا۔ حقارت سے وہ آنکھیں بند کر لیا کرتی۔ ہونٹ کاٹ کاٹ لیتی۔ اس کی روح تک چلا اٹھتی مگر خود وہ مہر بہ لب رہتی۔ ایسے موقعوں پر مرد کی نفرت کا جذبہ اس شدت سے ابھرتا کہ اس کا دل چاہتا کہ ثاقب کو کسی طرح موت کے گھاٹ اتار دے لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکتی...........

اسے ماں کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔

ماں........... جس نے بڑے ارمانوں سے اسے دلہن بنا کر ثاقبت کے حوالے کیا تھا۔

اور آصف...........

جس کے مستقبل کی تابناکی بھی ثاقب کے ہاتھ میں تھی۔

ایسی صورت میں وہ بھلا چپ نہ رہتی تو اور کیا کرتی، لیکن اس کی سوچوں پر تو کوئی بندش نہ تھی۔ رات کی ویرانیوں میں آنکھیں موندے سوچا کرتی۔ مرد کس قدر خودغرض ہوتا ہے۔ وحشی اور درندہ بن جاتا ہے۔ اسے صرف اپنے جذبات سے سروکار ہوتا ہے

دوسروں کی بے کسی پر اُسے ذرا ترس نہیں آتا۔

اُس کی شادی کو آج پورے تین ماہ گزر چکے تھے اور ان تین ماہ میں وہ برابر ایک مرد کے ہاتھوں لٹتی رہی تھی۔ بے زبان بکری کی طرح جو قصائی کے سامنے سہمی سہمی نظر آتی ہے۔ حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھتی رہتی ہے لیکن قصائی کتنی بے دردی سے اس کے گلے پر چھُری پھیر دیتا ہے۔ عاصمہ کی اپنی کیفیت بھی کسی بکری سے کم نہ تھی۔ وہ بھی تو ایک قصائی کے ہاتھوں فروخت کر دی گئی تھی۔ وہ بھی تو اپنی مرضی کے خلاف برابر تین ماہ سے ذبح ہو رہی تھی۔ زبردستی کے سودے کو نپٹاتی رہی تھی۔ اپنے جذبات اور پاکیزگی کو کچلتی رہی تھی لیکن اُس نے کبھی ثاقب کو رحم طلب نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اُس سے کبھی اچھے سلوک کی تمنا بھی نہ کی تھی۔ وہ تو اپنی جگہ ایک چٹان کی طرح اٹل تھی۔ آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اور پھٹ پڑنے کے لئے وقت کی منتظر تھی۔

ان تین ماہ میں وہ ثاقب سے صرف اسی قدر بے تکلف ہوئی تھی کہ اس کی باتوں کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دے دیا کرتی' ورنہ اگر اُس کے بس کی بات ہوتی تو وہ کبھی اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی۔

زندگی اسی ڈھب پر بڑی سُست رفتاری سے گزرتی رہی۔ وہ ثاقب سے دور رہ کر ہمہ وقت نسیمہ بیگم کی خدمت میں مصروف رہتی۔ ان کی ہر بات کا خیال رکھتی' لیکن نسیمہ بیگم جب اس کی خدمت سے خوش ہو کر اسے دعائیں دیتیں تو وہ اندر ہی اندر سلگ اٹھتی۔ اسے ان دعاؤں کی ضرورت نہیں تھی۔

سہاگ کو اُس نے محض ایک ضرورت کے تحت اپنا رکھا تھا۔ لیکن سہاگ برقرار رہنے کی تمنا تو اُس نے کبھی نہ کی تھی اور پھر وہ شادی بھی تو زبردستی کا سودا تھی۔ اُس نے بھلا کب ثاقب کو شوہر کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ اسے تو مرد کے نام ہی سے نفرت تھی۔

آج بھی وہ نسیمہ بیگم کے لئے رات کو دودھ کا گلاس لے کر گئی تو انہوں نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ کر کہا تھا۔

"خدا تمہیں سلامت رکھے عاصمہ بیٹی! تمہارا سہاگ برقرار رہے۔ زندگی کی بہاریں نصیب ہوں' سدا سکھی رہو۔"

جواب میں وہ خشک ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم بکھیر کر رہ گئی' لیکن دل تو اندر ہی اندر سلگ اٹھا تھا۔ وہ ان دعاؤں کا استقبال بھلا کیسے کر لیتی۔ اسے کانٹوں کی سیج پر ڈال کر خوش رہنے کی دعائیں دی جا رہی تھیں۔ خزاں کے منحوس تھپیڑے اس کی زندگی' اس کی جوانی اور اس کے ارمانوں کو جھلسائے دے رہے تھے اور اسے زندگی کی بہاریں دیکھنے کی دعا دی جا رہی تھی۔ وہ مجسم دکھ بن گئی تھی اور اس کے سکھی رہنے کی تمنا کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

کتنی مضحکہ خیز تھیں یہ دعائیں............

کیسی انہونی باتیں ہو رہی تھیں............

لیکن اس کے باوجود وہ مسکرانے پر مجبور تھی۔

ماں کی خوشیوں کا احترام جو لازم تھا............

بھائی کے تابناک مستقبل کا مسئلہ جو درپیش تھا۔

دودھ کا خالی گلاس اٹھائے وہ واپس جانے کے لئے پلٹی تو نسیمہ بیگم نے اُسے آواز دے دی۔

"عاصمہ بیٹی!"

"جی............" وہ سر پر آنچل ڈالے گردن جھکائے پلٹ کر ان کے قریب آ گئی۔ دل اس خوف سے دھڑک اٹھا تھا کہ کہیں پھر اسے زندگی کی بہاریں دیکھنے کی دعا نہ دی جائے۔

"الماری میں مٹھائی کا ڈبہ رکھا ہے اُسے اپنے کمرے میں لے جانا۔"

"جی اچھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ثاقب نے تو تمہیں بتا دیا ہو گا کہ آصف میاں کی ترقی ہو گئی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"خدا اسے سلامت رکھے۔ بڑا ہونہار نیک اور سعید بچہ ہے۔" نسیمہ بیگم نے آصف کو دعا دیتے ہوئے کہا۔ "ثاقب کا خیال ہے کہ آصف میاں بی اے کر لیں تو انہیں کوئی اچھا سا عہدہ دلا دیا جائے۔"

وہ خاموش رہی اس کا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ شاید نسیمہ بیگم بھی اس پر اپنے احسانوں کا اظہار کرنا چاہتی ہیں اور پھر یہ سوچ کر اُس کے دل میں ہُوک اٹھی

تھی کہ بھائی کے مستقبل اور ماں کی خوشیوں کی خاطر اسے کتنی بڑی قربانی دینی پڑی تھی۔

اپنی زندگی کی قربانی.........

اپنی روح کی پاکیزگی کی قربانی.........

ایک عورت کی نسوانیت کی عظیم قربانی.........

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو نسیمہ بیگم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں آصف کی ترقی کی خوشی نہیں ہے؟"

"جی.........." وہ چونک پڑی۔ خیالات کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا۔ جلدی سے دل کی دھڑکنوں پر قابو پا کر بولی۔ "مجھے بے حد خوشی ہے لیکن اصل خوشی تو آپ کو ہونی چاہئے۔ آپ کی مہربانیوں ہی سے آصف کسی قابل ہوا ہے۔"

"کیسی غیریت کی باتیں کر رہی ہو بیٹی!" نسیمہ بیگم کے لہجے میں خلوص تھا۔ "ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ یہ سب کچھ تو اللہ کی کرم نوازیوں کا نتیجہ ہے۔"

"جی.........." وہ دبی زبان میں بولی اور کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

"کیا بات ہے عاصمہ بیٹی! تم یہ ہر وقت چپ چپ سی کیوں رہتی ہو؟"

"جی .... کچھ بھی نہیں۔"

"ہنسا بولا کرو بیٹی! خاموش رہنے سے صحت پر خراب اثر پڑے گا اور پھر اب تو یہ تمہارا اپنا گھر بھی ہے۔"

"اپنا گھر.........." عاصمہ کا وجود تک تڑپ اٹھا۔ ماں نے بھی تو یہی کہا تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے گھر کی مالک ہو گی۔ اس کی اپنی ایک دنیا ہو گی۔ جہاں اس کا راج ہو گا' لیکن ایسا تو نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر کی ہو کر بھی کتنی بے بس تھی۔ اپنی دنیا میں آنے کے بعد بھی اس کی روح کو سکون میسر نہ آ سکا تھا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بے چینی ہو گئی تھی۔ وہ راج کرنے کے بجائے خود تاراج ہو کر رہ گئی تھی اور یہ سب کچھ ایک مرد کی وجہ سے ہوا تھا' جس نے دولت کی جھلک دکھا کر اسے خرید لیا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف اس کی مجبوریوں کا سودا کیا تھا۔ اُسے کھلی فضا سے نکال کر گھٹے گھٹے ماحول میں ڈالا تھا جہاں اُس کا نہیں بلکہ ایک مرد کا راج تھا.........

مرد.........

جو اپنی مرضی کا مختار تھا.........

جس نے روح کی گہرائیوں سے نہیں بلکہ جسم کے نشیب و فراز سے محبت کی تھی۔

جس نے عورت کی وفا سے پیار کرنے کے بجائے اُس کی جسمانی لذتوں سے پیار کیا تھا.........

یہ کیسی شادی تھی.........؟

کیسا پیار تھا.........؟

کیسا سہاگ تھا.........؟

جس میں عورت کی اپنی خوشیوں کو کوئی دخل نہ تھا.........

جہاں صرف مرد کی خواہشات اور اُس کی بربریت کا راج تھا.........

مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لئے وہ لرزتے وجود کو سنبھالے ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے میں گئی تو ثاقب اُس کے منتظر تھے۔ ریشمی ڈریسنگ گاؤن میں وہ سچ مچ پریوں کے دیس کے راجہ لگ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں آج بھی وہی سادگی اور معصومیت موجود تھی جسے عاصمہ روزِ اوّل سے دیکھتی چلی آئی تھی۔ ان کے چہرے کا حُسن اب بھی نکھرا نکھرا تھا۔ مردانہ وقار اور گھمبیر شخصیت آج بھی ویسی ہی لگ رہی تھی جیسے پہلے تھی۔

عاصمہ نے چور چور نظروں سے ثاقب کو دیکھا' جو کھڑکی کے قریب کھڑے دور آسمان پر بکھری ہوئی چاندنی اور اُس کے درمیان مسکراتے چاند کو دیکھنے میں محو تھے۔ ایک لمحہ کے لئے عاصمہ کا دل چاہا کہ اپنے دل سے مرد کی نفرت کو نکال پھینکے۔ ثاقب کو کبھی مرد کی طرح نہیں بلکہ اپنے شوہر کی طرح آزما کر دیکھے اور پھر یہ محسوس کرے کہ شادی ایک اہم ضرورت کا نام کیوں ہے.........

اُس کا دِل چاہا' وہ بھی اپنی دنیا میں قہقہے بکھیرے' اپنے گھر پر رانی بن کر راج کرے۔ ثاقب کی بانہوں میں چھپ کر اپنے تمام غموں کو بھلا دے۔ اُس کی آغوش میں یوں سمٹ کر رہ جائے کہ ماضی کی تلخیاں اُسے کبھی تلاش نہ کر سکیں۔ وہ سب کچھ بھول کر ایک نئے سرے سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے۔

مٹھائی کا ڈبہ سنگھار میز پر رکھ کر وہ دبے دبے قدموں' نئی امنگوں کو سہارا دیتی بڑی آہستگی سے ثاقب کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر چودھویں تاریخ کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اس کے گرد بکھرے ہوئے اَن گنت ننھے ننھے تارے مسکراتے

نظر آ رہے تھے۔ باہر سبزے کے اطراف میں کیاریوں میں پھولدار پودے چاندنی میں غسل کر رہے تھے اور نرم و نازک ٹہنیوں پر ادھ کِھلی کلیاں نہ جانے کیوں شرما کر پتیوں کی آڑ میں چھپی جا رہی تھیں۔

"کیا دیکھا جا رہا ہے اتنے غور سے؟" عاصمہ نے پہلی بار دل کی گہرائیوں سے ثاقب کو مخاطب کیا۔

"تم.........." ثاقب نے چونک کر قریب کھڑی عاصمہ کو دیکھا' پھر مسکرا کر بولے۔

"میں ذرا چاند کو دیکھ رہا تھا۔"

"بڑا خوبصورت لگ رہا ہے؟"

"ہاں' لیکن تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔" ثاقب نے کہا تو آج وہ پہلی بار سچ مچ دلہنوں کی طرح شرما کر رہ گئی۔ نئے جذبات کی نئی دھڑکنیں جاگیں تو اس کا پورا وجود کیف و سرور میں ڈوب کر رہ گیا۔

"کیوں.......... کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے؟"

"مجھے کیا پتہ؟"

"یقین نہیں آتا تو میرے دل میں جھانک کر دیکھو لو.........."

"اب آپ شاید مجھے بنا رہے ہیں۔" وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

"سچ کہہ رہا ہوں عاصمہ! تم میرے لئے اس چاند سے زیادہ حسین اور تابناک ہو جو آسمان پر چمکتا ہے۔"

کتنا خلوص' کس قدر پیار اور کتنی اپنائیت تھی ثاقب کے لہجے میں۔ عاصمہ کا معصوم دل خوشی کے جذبوں سے سرشار ہو گیا۔ آج اُس نے پہلی بار اپنے اندر کی عورت کو مار کر شوہر کی محبت کو محسوس کیا تھا۔ انجانے جذبوں سے دل دھڑکے جا رہا تھا۔ دوپٹہ کے آنچل کو حنائی ہاتھوں میں لئے وہ نہ جانے کیوں مسلے جا رہی تھی۔

"عاصمہ.........."

"جی.........." اس کی روح گنگنا اٹھی۔

"آج تم سچ مچ بہت حسین لگ رہی ہو۔" ثاقب اُس کے قریب ہو کر بولے۔

"میں تو پہلی ہی جیسی ہوں۔" وہ دبی آواز میں بولی۔

"ایک بات کہوں؟"

"کہئے.........."

"پہلے میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ تم جان بوجھ کر مجھ سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرتی ہو۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ نادم سی ہو کر رہ گئی..........

"چپ کیوں ہو گئیں' کچھ بولو نا!"

"امی جان کا خیال رکھنا بھی میرے فرائض میں داخل ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ شادی کے بعد سے اُس نے نسیمہ بیگم کو بھی امی جان کہنا شروع کر دیا تھا۔

"اور میں جو تمہارا انتظار کرتا رہتا ہوں۔" ثاقب نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کبھی میرا بھی خیال کر لیا کرو۔"

وہ شرما کر رہ گئی۔

"میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو عاصمہ!"

عاصمہ نے آہستہ سے پلکوں کی چلمن اٹھا کر ثاقب کی آنکھوں میں جھانکا جہاں محبت کے نہ جانے کتنے ہی چراغ روشن تھے..........

"کیا ہے؟.......... مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔"

عاصمہ نے پہلی بار شوخ مسکراہٹ سے پوچھا۔

"کیا تمہیں پیار کی جھلکیاں نظر نہیں آ رہی ہیں؟"

"پیار.......... یہ کیا ہوتا ہے؟" وہ دھڑکتے دل سے بولی۔

"اتنی شوخ نظروں سے نہ دیکھو ورنہ۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟" وہ مسکرا کر بولی۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو گلنار بنا دیا تھا۔ حُسن آج خود عشق کی بارگاہ میں چل کر آیا تھا۔ اس لئے اس کی رعنائیاں بھی دوچند ہو گئی تھیں۔

ثاقب کچھ دیر تک اسے والہانہ نظروں سے کھڑے دیکھتے رہے پھر ذرا سا جھکے اور اس کے ہونٹوں کی سرخی چرالی۔

"ثاقب!" عاصمہ کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ دل پر قابو پا کر بولی۔ "کیا ہم صرف دوستوں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے؟"

"یہی بات تم نے سہاگ رات کو بھی کہی تھی' لیکن میں سمجھ نہیں سکا تھا تمہارا

مطلب.........."

"میرا مطلب یہ ہے کہ .... ہم دونوں .... یعنی میں اور آپ.........."

عاصمہ ہچکچا کر رہ گئی۔ اپنا مفہوم نہ بیان کر سکی۔

"کیا ہم دوست نہیں ہیں؟" ثاقب نے پوچھا۔

"ہاں .... لیکن.........." وہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی' تو ثاقب نے آگے بڑھ کر بتی بجھا دی۔ کمرے میں اب صرف ایک مدھم روشنی کا نیلا اور ملگجی عکس باقی رہ گیا تھا۔

عاصمہ سہم اٹھی۔ اسے تو شروع دن سے اس ملگجی روشنی سے نفرت ہو گئی تھی جس نے اُس کی روح کو ڈس لیا تھا۔

"ثاقب' آپ نے یہ بتی کیوں بجھا دی؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اس لئے کہ یہی اندھیرے تو نئی زندگیوں کو جنم دیتے ہیں۔" ثاقب نے سرگوشی کی۔ پھر عاصمہ کو بازوؤں کے حلقے میں لئے فوم کی مسہری پر آ گئے اور پھر..........

عاصمہ کے اندر کی عورت دوبارہ جاگ اٹھی۔ اُس کی روح میں ایک اور گہرے گھاؤ کا اضافہ ہو گیا۔ ملگجی روشنی کے ملگجے دھندلکوں نے ایک بار پھر اُسے ڈس لیا۔ وہ ایک بار پھر برف کا تودہ بن کر رہ گئی۔ مرد سے نفرت کا سویا ہوا جذبہ تڑپ کر بیدار ہو گیا۔ اسے پیار کا یہ انداز بالکل نہ بھایا تھا۔ اُس نے تو بڑے اعتماد سے ثاقب کو زندگی میں پہلی بار اپنانے کی کوشش کی تھی' لیکن پہلی ہی منزل میں اس کا اعتماد کانچ کے ٹکڑوں کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ مرد خودغرضی کا دوسرا نام ہے۔ ماضی کے جن دریچوں کو اُس نے بند کرنے کی کوشش کی تھی وہ سارے کے سارے ایک ہی جھٹکے میں کھل گئے تھے اور وہ حقارت سے ہونٹ بھینچے سوچ رہی تھی۔

مرد ہمیشہ سے خودغرض ہے..........

وہ روح کی گہرائیوں سے زیادہ جسم کی رعنائیوں سے پیار کرنے کا عادی ہے۔

اسے عورت کی وفا کی ضرورت نہیں ہوتی..........

اسے عورت کے پیار سے کوئی غرض نہیں ہوتی..........

وہ جسم کا پجاری ہوتا ہے..........

خوبصورت اور جوان جسم کا شیدائی..........

جسے کبھی شبانہ بیگم کی صورت میں اپنایا جاتا ہے..........

کبھی ناہید کی شکل میں حجلۂ عروسی کی زینت بنایا جاتا ہے۔

اور کبھی عاصمہ کے روپ میں ملگجی اندھیروں میں لوٹا جاتا ہے..........

اس رات وہ ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکی تھی اور جب نئی صبح نے رات کے اندھیروں کو دور کیا تو عاصمہ ایک بار پھر ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر رہ گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ کبھی وہ مرد کے اعتماد کو آزمانے کی سعی نہیں کرے گی۔ اپنے جذبات کا یوں مذاق نہیں اڑنے دے گی۔ اپنی نسوانیت کو خود اپنے ہاتھوں سے کبھی مجروح نہیں ہونے دے گی۔ اپنے وقار کو ٹھیس نہیں لگنے دے گی۔ عورت کی عظمت کو ہمیشہ سربلند رکھنے کی کوشش کرے گی۔

وہ ایک بار پھر برف کا تودہ بن جائے گی..........

برف کا تودہ..........

جو گرم خاصیت رکھنے کے باوجود ہمیشہ سرد رہتا ہے..........

جیسے اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ ہو..........

☆======☆======☆

شراب کی تلخیوں نے اور کلب کی گوناگوں رنگینیوں نے عارف علی کو زندگی گزارنے کا ایک موقع ضرور فراہم کر دیا تھا لیکن دل کا قرار اور ذہنی سکون تو اسی وقت سے برباد ہو چکا تھا جب انہوں نے ناہید کی جوانی کے نشے میں اندھا ہو کر شبانہ بیگم اور عاصمہ کو گھر سے نکال دیا تھا..........

دولت کی قوتِ خرید نے انہیں وقتی طور پر ایک نئی لذت اور ایک نئی راحت ضرور فراہم کر دی تھی لیکن وہ سب سراب تھا' دھوکہ تھا' فریب تھا اور جب فریب کا یہ طلسم ٹوٹا تو عارف علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب تک ریت کے ٹیلے پر کھڑے جھوٹی بلندیوں کے غرور سے سرشار تھے' لیکن جب ریت کا یہ ٹیلہ اپنی جگہ سے سرکا تو ایک ہی جھٹکے میں وہ زمین پر آ رہے۔ تنہائی کے احساس نے جھلسا دینے والے لُو کے تھپیڑوں کے مانند اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وقت اپنے محور پر تیزی سے گردش کرتا رہا۔ شبانہ بیگم کی وفاؤں اور ناہید کی بے مروتی کے صدمے نے عارف علی کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ ایک خلش تھی جو مٹائے نہ مٹتی تھی۔ ایک درد تھا جس کا کوئی درماں نظر

نہ آتا تھا۔ زندگی کی انہی پے در پے محرومیوں سے اُکتا کر انہوں نے شراب کا سہارا لیا تھا لیکن شراب کی تلخی بھی غمِ حیات پر غالب نہ آ سکی اور دل کا گھاؤ بڑھ کر ناسور کی شکل اختیار کر گیا..........

اب نہ عارف علی کو اپنی دولت پر ناز تھا نہ اپنی شہرت پر کوئی غرور باقی رہا تھا۔ دو ہی جھٹکوں نے جیسے ان کے تمام احساسات کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور اب وہ محض جینے کی خاطر جی رہے تھے۔

زندگی کی ساری گہما گہمی ایک ایک کر کے منہ موڑ گئی تھی۔
پہلے شبانہ بیگم کی وفاؤں کی شکل میں .... اور
پھر ناہید کے روپ میں ....
شبانہ بیگم کی مشرقی تہذیب نے انہیں زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار کیا تھا۔
لیکن ....
ناہید کے مغربی تمدن نے انہیں ناگن بن کر ڈس لیا تھا..........

زہر ایسا کاری تھا کہ عارف علی کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا' وہ تڑپ کر رہ گئے' لیکن بدلی ہوئی نگاہوں نے اُن کو اِس بار بڑھ کر سہارا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شہرت کی دھجیاں تو اسی روز بکھر کر رہ گئی تھیں جب ناہید نے بھری محفل میں پرنس اکبر کا ہاتھ تھام کر عارف علی کے وقار کو ٹھوکر مار دی تھی۔ غرور کا سر خود بخود جھک گیا تھا اور اب وہ زندگی کی ناکامیوں سے پیار کرنے کا انداز سیکھنے کی خاطر شراب کے چھلکتے ہوئے جاموں میں غرق ہوتے جا رہے تھے۔

قدرت' عارف علی کی حالت پر مسکرا رہی تھی اور اُس نے دل کھول کر انہیں ڈھیل دے رکھی تھی۔ وہی عارف علی جو کل تک سوسائٹی کی جان سمجھے جاتے تھے آج محض ناہید کی خاطر ہم پیالہ و ہم نوالہ افراد کی پھبتیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ایک عورت کی بے وفائی نے انہیں عرش سے فرش پر لا کھڑا کیا تھا۔ انہیں اب بزنس سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی' اُن کا زیادہ تر وقت مے نوشی میں گزرتا اور جب تلخیِ دوراں سے فرصت ملتی تو غمِ حیات ان کی آنکھوں کے راستے سے چھلک اٹھتا۔

وہ سسک سسک کر اپنی روٹھی ہوئی خوشیوں کو منانے کی سعی کرتے' بلک بلک کر کاتب تقدیر سے اپنی قسمت کی محرومیوں کا گلہ کرتے اور..........

کبھی کبھی جب ندامت کا احساس شدت اختیار کر جاتا تو وہ پہروں شبانہ بیگم کی خاموش اور بے زبان تصویر کو ہاتھوں میں لئے ہمکلام رہتے..........

"شبانہ! میری بدنصیبی پر رحم کھا کر صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی تمہارے دل کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ تمہاری دفاؤں کی کشادہ آغوش سے دور ہو کر میں مٹ گیا ہوں۔ زندگی کا سکون برباد ہو گیا ہے۔ مجھے ایسے میں تمہاری ضرورت ہے شبانہ!"

اور کبھی یوں گویا ہوتے..........

"شبانہ! کبھی بھولے ہی سے آ کر ایک نظر دیکھ جاؤ کہ وہ چمن زار جو تمہاری وفاؤں سے مہک اٹھا تھا' آج کیسا اجاڑ بن کر رہ گیا ہے۔ زندگی کے جن مرغزاروں کو تم نے اپنی محبت کی پاکیزگی سے فردوسِ بریں اور رشکِ ارم بنایا تھا آج یوں لگتا ہے کہ زندگی کے سراغ بھی فنا ہو گئے ہیں۔ میری برباد زندگی کو تمہاری وفاؤں کی ضرورت ہے۔ شبانہ! میرے گرتے ہوئے وجود کو آ کر سہارا دے دو' ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ میں تمہارا گناہگار ہوں شبانہ! میں نے دولت کے نشے میں غرق ہو کر تمہاری وفاؤں کو ٹھکرا دیا۔ ناہید کے دامِ فریب میں پھنس کر خود اپنی ہنستی کھیلتی زندگی کا سکون برباد کر دیا تھا۔ شہرت کے نشے میں چُور ہو کر بھٹک گیا تھا۔ آج بھی بھٹک رہا ہوں' لیکن منزل کا پتہ نہیں ملتا۔ صرف ایک بار آ کر میری منزل کا نشان بتا جاؤ۔ تمہارے بغیر تو شاید موت بھی مجھے اپنانے سے انکار کر دے۔"

کبھی وہ بڑی اپنائیت سے گلہ کرتے۔

"شبانہ! میں ایک بار بڑی امیدوں سے تمہاری چوکھٹ پر سوالی بن کر آیا تھا.......... جانتی ہو کیوں.......... اپنی بارہ سالہ غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے.......... ہاں شبانہ! مجھے اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا تھا۔ میں تمہارے قدموں پر سر رکھ کر آنسو بہانے کا متمنی تھا' مجھے امید تھی کہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تمہارا نرم دل ضرور پسیج جائے گا۔ پہلے بھی تو ہمیشہ یوں ہی ہوا تھا۔ میں جب بھی افسردہ ہوتا تم تڑپ اٹھتی تھیں۔ میں جب بھی اداس ہوتا تم مجھے اپنی محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بٹھا کر خوش آئند مستقبل کی باتیں کیا کرتی تھیں اور میں اپنا دکھ بھول کر تمہارے پیار کی آغوش میں کس قدر سکون کی نیند سو جایا کرتا تھا' لیکن اب تو میری نیندیں مجھ پر جیسے حرام ہو گئی ہیں

..........ہاں شبانہ! اب میں خون کے آنسو روتا ہوں۔ مگر کوئی ان آنسوؤں کو اب اپنے آنچل کی وسعتوں میں جذب نہیں کرتا۔ لوگ میری بربادیوں کا مذاق اڑاتے ہیں' میرے رونے پر خوش ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شبانہ! مَیں تم کو منالوں گا لیکن جانتی ہو کیا ہوا..........؟ عاصمہ نے مجھے دیکھ کر نفرت سے نگاہیں پھیرلیں' حقارت سے دھتکار دیا' مجھے خود میری نظروں میں اتنا گرا دیا کہ میں اب سنبھلنے کی قوت بھی کھو چکا ہوں.......... مجھے تمہاری ضرورت ہے شبانہ! تم اگر مجھے معاف کر کے اپنالو تو زندگی کی تمام خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں گی..........!"

لیکن جواب میں شبانہ بیگم کی تصویر مہر بہ لب رہتی۔ اس انداز میں جیسے انہوں نے چپ چاپ زندگی کی طویل مدت گزار دی تھی۔ اس وقت بھی وہ مہربلب تھیں جب ماں نے انہیں ڈولی میں بٹھا کر عارف علی کے حوالے کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاموش رہی تھیں جب عارف علی نے ان کی وفاؤں کو ٹھکرا کر اپنی زندگی کو غالباً رنگینیوں سے سنوارنے اور سجانے کے لئے ناہید کو اپنایا تھا اور آج بھی وہ مہر بہ لب تھیں جب عارف علی ان سے اپنی روٹھی ہوئی خوشیوں کو واپس لوٹا دینے کے لئے گڑگڑا رہے تھے۔ کتنا فرق تھا ان میں اور ناہید میں کس قدر تضاد تھا ایک ہی جنس کے دو مختلف روپ میں..........

دونوں ہی عورت تھیں..........

شبانہ بیگم اور ناہید..........

ایک وفا کی پتلی تھی اور دوسری جفاؤں کا مجسمہ..........

ایک نے شوہر کی خوشیوں کی خاطر اپنی مسکراہٹوں کو قربان کر دیا تھا' خود کو شوہر کی مسرتوں کی راہ کی دیوار نہیں بنایا تھا..........

زندگی کی معصومیوں کو عاصمہ کی صورت میں گلے سے لگا کر شوہر کے راستے کو صاف کر دیا..........

آنکھوں میں اشک لئے اس دہلیز کو چھوڑ دیا جہاں ان کی وفائیں آج بھی دفن تھیں..........

دوسری عورت ناہید تھی..........

جو ہوا کے ایک معطر جھونکے کی طرح عارف علی کے وجود سے ٹکرا کر گزر گئی۔

جس نے صرف دولت کی خاطر عارف علی کو اپنایا تھا..........

کتنی عجیب تھی یہ شادی جس میں پیار کو کوئی دخل نہیں تھا..........

محبت کی کوئی چاشنی نہ تھی۔ آرزوؤں اور تمناؤں کی فراوانی نہ تھی..........

بہکے بہکے خیالات اور سہمی سہمی نسوانیت کی امنگوں کو کوئی سروکار نہ تھا..........

عارف علی نے بھنورا بن کر ایک کلی کو اپنی زندگی کے چمن زاروں میں آباد کرنے کی تمنا کی تھی' لیکن ناہید نے صرف دولت کی جھنکار سنی تھی۔ مستقبل کے حسین خوابوں کی تکمیل کی خاطر عارف علی کو محض ایک کامیاب ذریعہ سمجھ کر اپنا لیا تھا اور پھر جب اس نے پرنس اکبر کو عارف علی سے زیادہ دولت مند پایا تو اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔

عارف علی کو زندگی سے اب کوئی پیار نہ رہا تھا۔ وہ تو اب اپنی شہرت اور غرور کو سر نگوں کرنے کی ٹھان چکے تھے۔ انہیں دولت اور شہرت سے نفرت ہو گئی تھی' شاید اس لئے کہ اسی دولت اور شہرت نے ان کے دل کا چین لوٹا تھا۔ سکون کا ایک مبہم اور دھندلا دھندلا سا احساس اب بھی شبانہ بیگم کی مہر بہ لب تصویر کی صورت میں باقی رہ گیا تھا جو عارف علی کو تنہائی میں بہلایا کرتا تھا۔

آج بھی وہ اپنی خواب گاہ میں بیٹھے اسی تصویر کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ جب ملازم نے کمرے میں داخل ہو کر عبدل کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

"اسے بٹھاؤ میں آتا ہوں۔" عارف علی نے ملازم سے کہا۔ پھر بیوی کی تصویر کو میز پر رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

عبدل کی آمد کی اطلاع نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں کسی انجانے جذبے سے تیز ہو گئی تھیں۔ یہی عبدل تو تھا جس نے انہیں ان کی کھوئی ہوئی منزل کا پتہ بتایا تھا۔

منزل..........

جس کو پا لینے کی تمنا سینے میں لئے وہ بیوی کے دروازے تک گئے تھے' لیکن مایوس ہو کر پلٹ آئے تھے اور پھر وقت نے انہیں قدم جمانے کی مہلت بھی نہ دی تھی کہ خزاں کے منحوس بادل چھا گئے۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں پہنچے تو عبدل انہیں دیکھ کر احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسے ہو عبدل!"

"دعا ہے سرکار کی۔"

"بیٹھو نا عبدل کھڑے کیوں ہو؟"

کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر عارف علی نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"آصف وغیرہ کا کیا حال ہے؟"

"آصف میاں تو بڑے مزے میں ہیں سرکار! اُن کی ترقی بھی ہو گئی ہے' سنا ہے اب آفیسر بن گئے ہیں۔"

"اچھا.........!" عارف علی نے لرزتی آواز میں کہا۔ خوشی کی ایک کمزور سی لہر اٹھ کر ان کے وجود سے ٹکرائی پھر واپس لَوٹ گئی۔

"میں باہر گیا ہوا تھا سرکار! ورنہ آپ سے دونوں خوشیوں کی مٹھائی ضرور مانگتا۔"

"دوسری خوشی کیا ہے عبدل!"

"کیا آپ کو نہیں معلوم سرکار! کہ عاصمہ بٹیا کی شادی بھی ہو گئی ہے۔"

"عاصمہ کی شادی ہو گئی.........!" عارف علی کا دل خوشی اور صدمے کے ملے جلے جذبات سے دھڑک اٹھا۔ انہیں یوں لگا تھا جیسے دل کی دھڑکنیں آج ان کا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گی۔

عاصمہ کی شادی کی خبر سن کر انہیں سکتہ سا ہو گیا' اس احساس نے کہ باپ ہوتے ہوئے بھی وہ بیٹی کی شادی میں شریک نہ ہو سکے' انہیں تڑپا دیا تھا۔ بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے اندر ہی اندر دل کو مسوستے رہے۔ پھر پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب کر کے بولے۔

"تم نے یہ اطلاع مجھے پہلے کیوں نہیں دی؟"

"میں اگر یہاں ہوتا تو ضرور اطلاع دیتا سرکار!" عبدل بولا۔ "آج ہی باہر سے آیا ہوں۔ جیسے ہی یہ خبر ملی آپ کے پاس چلا آیا۔"

"کہاں ہوئی ہے عاصمہ کی شادی؟" عارف علی کی کپکپاتی آواز ابھری۔

"بڑا اچھا گھرانہ ہے سرکار! بٹیا عیش کرے گی.........."

"لڑکا کیا کرتا ہے؟"

"نہر کے محکمے میں آفیسر ہے سرکار' سنا ہے ہزار سے اوپر تنخواہ ملتی ہے۔ کوٹھی میں رہتے ہیں وہ لوگ۔ گاڑی بھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لڑکا بڑا نیک اور

شریف ہے۔ محلے کے سب لوگ اسے اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔"

"نام کیا ہے اس کا؟"

"ثاقب۔"

"کب ہوئی یہ شادی؟" عارف علی نے رندھی آواز میں پوچھا۔

"اب تو اللہ رکھے تین ماہ گزر چکے ہیں۔"

"تین ماہ.........." عارف علی کو ایک اور دھچکہ لگا۔ ہونٹ کاٹ کر بولے۔ "باقی لوگوں کا کیا حال ہے؟"

"آپ شاید بیگم صاحبہ کے لئے پوچھ رہے ہیں؟" عبدل نے صوفے پر پہلو بدل کر کہا۔ پھر قدرے دبی آواز میں بولا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا سرکار' لیکن سنا ہے بیگم صاحبہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔"

"وہ بیمار تو نہیں رہتیں؟" عارف علی نے تیزی سے پوچھا۔

"اب تو نہیں ہیں سرکار! لیکن تپ دق کے موذی جراثیم بھلا انسان کا پیچھا کہاں چھوڑتے ہیں؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو' شبانہ کو تپ دق کب ہوئی؟" عارف علی تقریباً چیخ اٹھے۔

"بہت عرصے سے ہے سرکار! بڑے ہسپتال میں علاج ہوتا رہا ہے۔"

"لیکن تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"مجھے پہلے اس کی اطلاع نہیں تھی سرکار!" عبدل دبی زبان میں بولا۔

لیکن عارف علی نے جیسے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ بڑی بے چینی سے اٹھ کر پشت پر ہاتھ باندھے ٹہلنے لگے۔ چہرے پر اظہارِ تاسف جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں درد و رنج تیر رہا تھا۔ شبانہ بیگم کی کیفیت معلوم ہو جانے کے بعد وہ خود کو مجرم سمجھنے لگے تھے۔ ندامت کا احساس کچھ اور شدید بن کر ان کے ذہن سے ٹکرایا تھا۔

دیر تک وہ عبدل کو نظرانداز کئے اپنی سوچوں میں گم ٹہلتے رہے۔ پھر جب عبدل نے مخاطب کیا تو یوں چونکے جیسے کچی نیند سے جاگ اٹھے ہوں۔

"میں اب چلوں گا سرکار!"

"اچھا.........." وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

عبدل چلا گیا تو وہ اپنی خوابگاہ میں آ گئے۔ شبانہ کی تصویر سے گھنٹوں پاگلوں کی

طرح باتیں کرتے رہے۔ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہے۔ غموں کا احساس آج اتنا شدید ہو گیا تھا کہ ان کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ خوشی اور رنج کی اطلاع نے مل جل کر انہیں یوں جکڑ لیا تھا کہ دم گھٹا جا رہا تھا۔ ذہن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ سانس سینے میں کہیں اٹکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لرزتے کپکپاتے ہونٹوں پر جیسے بے شمار آہیں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ شبانہ بیگم کی تصویر کو یوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جیسے پتلیوں نے حرکت نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ پپوٹے بوجھل ہو کر درد کرنے لگے تھے۔ عبدل کی دی ہوئی اطلاع نے انہیں بڑی صبر آزما کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

آصف کے افسر بن جانے کی اطلاع پا کر ان کا سینہ فخر سے تن گیا تھا............

انہوں نے خیالی گہرائیوں میں جھانک کر بیٹے کو کرسی پر بیٹھ کر قلم چلاتے دیکھا تو خوشی سے ان کی روح تک جھوم اٹھی............

انہیں اس بات پر ازحد مسرت ہوئی تھی کہ آصف کسی قابل بن گیا اور پھر عاصمہ کی شادی کی اطلاع سن کر ان کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ انہوں نے عاصمہ کو تصور ہی تصور میں دلہن بنے دیکھا تو تڑپ کر رہ گئے لیکن جب داماد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو دل کو قدرے چین آ گیا............

لیکن............

شبانہ بیگم کے بارے میں یہ جان کر تو وہ ماہئ بے آب کی طرح تڑپ اٹھے تھے کہ وہ تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ ماضی کے دھندلکوں سے بیوی کا چہرہ جھلک کر ابھرا تو وہ مجسم درد بن گئے۔ اندر ہی اندر مسوس کر رہ گئے کہ یہ سب کچھ انہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ انہوں نے منہ موڑ کر جھوٹی مسرتوں کو اپنانے کی کوشش کی ہوتی نہ آج انہیں یہ دلخراش خبر سننی پڑتی۔

خیالات کے زاویے پھیلے تو وہ سوچنے لگے کہ نہ جانے اب شبانہ بیگم کس عالم میں ہوں گی۔ زندگی کے یہ طویل عرصے نہ جانے انہوں نے کن کن مصیبتوں سے گزارے ہوں گے۔ کیا کیا تکلیفیں جھیلی ہوں گی گھر کے اخراجات کیسے پورے کئے ہوں گے۔ آصف کی تعلیم کے بوجھ کو کس طرح برداشت کیا ہو گا۔ عاصمہ کی شادی کے مصارف ان کے ناتواں کاندھوں نے بھلا کیسے پورے کئے ہوں گے اور اب زندگی کے دن کیسے گزار رہی ہوں گی؟

عارف علی کا پریشان ذہن بکھرے بکھرے خیالات کو جنم دیتا رہا۔ گلابی گلابی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپک ٹپک کر شبانہ بیگم کی مہربہ لب تصویر پر گرتے رہے، لیکن آج ان آنسوؤں کو بہتا دیکھ کر بے چین ہونے والا کوئی نہ تھا۔ اس درد کا درماں اگر کرتا تو کون کرتا۔ کون ان کے زخموں پر مرہم رکھتا، مسیحا تو روٹھ چکا تھا............

ستاروں کی گردش اپنا رنگ دکھا رہی تھی............

قسمت کا لکھا پورا ہو رہا تھا............

اور قسمت کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے............!

☆======☆======☆

عاصمہ اندر ہی اندر جیسے گھلی جا رہی تھی۔

ثاقب نے جس انداز میں اس سے محبت کی تھی وہ انداز عاصمہ کو ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ وہ دوبارہ برف کا تودہ بن کر رہ گئی تھی، اس نے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر اپنی زندگی کو اسی روش پر ڈال دیا جس پر وہ تمام زندگی چلتی رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی از خود ثاقب سے بات نہیں کرے گی۔ اُس کی وفاؤں کو کبھی دوبارہ آزمانے کی حماقت نہیں کرے گی۔

گھر میں دنیا کی تمام آسائشیں موجود تھیں، لیکن عاصمہ تو جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔ اسے دولت کی چمک دمک سے کوئی پیار نہ تھا۔ جھوٹے قہقہوں کے بجائے اسے ابدی مسکراہٹ کی خواہش تھی جو رفتہ رفتہ دم توڑ گئی............

حالات بننے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ اُس نے اب نسیمہ بیگم کی خدمت میں بھی دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ سارا سارا وقت اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ وقت گزاری کے لئے رسالوں اور ناولوں سے دل بہلا لیا کرتی یا پھر جب دل کا درد زیادہ بڑھ جاتا تو اپنی قسمت پر آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی۔

شادی سے پہلے بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ مرد کی غلامی کبھی قبول نہ کرے گی۔ دنیا کے تمام مردوں سے اپنی ماں کی بربادی کا انتقام لے گی۔ گن گن کر ایک ایک کا حساب بے باق کرے گی۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک وہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہی، لیکن جب اس کے اندر کی عورت نے بیدار ہو کر انگڑائی لی تو اس کے جذبات بھی جاگ اٹھے۔ اس نے اپنی نفرت کو بھول کر ثاقب کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن ثاقب کے پیار کے انداز

نے اسے پھر پرانے راستے پر لا کھڑا کیا۔ ایک بار پھر وہ پہلے جیسی بن گئی۔

ایک نئے فرق کے ساتھ.........

ایک نئی تبدیلی نے سر اٹھایا.........

اور اِس فرق نے ثاقب کے تمام سنہری خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ پہلے جب وہ دفتر سے واپس آتے تو عاصمہ جھوٹی مسکراہٹوں کو ہونٹوں پر بکھیرے اپنے فرض کو نبھانے کی خاطر ان کے سامنے چلی جایا کرتی تھی' لیکن اب اتنی زحمت بھی گوارا نہ کرتی۔

ثاقب دفتر سے آتے تو وہ جان بوجھ کر کوئی کتاب اٹھا لیتی۔ خود کو منہمک ظاہر کرنے کی کوشش کرتی۔ پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھتی کہ ثاقب کب آئے اور کب چلے گئے۔ اس نے تو خود کو ہر فرض سے سبکدوش سمجھ لیا تھا۔ یوں جیسے اب اس کا ثاقب سے کوئی سروکار ہی نہ رہا ہو۔ ثاقب اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتے' پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ ممکن ہے یہ تبدیلی محض عارضی ہو۔ عاصمہ سے الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے عاصمہ کو پا لینے کی کتنی آرزو کی تھی۔ کیسی تمناؤں سے اسے بیاہ کر لائے تھے۔ کتنے خلوص سے اسے چاہا تھا' پیار کیا تھا۔ پھر وہ اپنے پیار اور اپنی محبت سے ناراض کیسے ہو سکتے تھے۔ عاصمہ کو مصروف دیکھتے تو مسکرا کر ٹال جاتے.........

لیکن آخر کب تک.........

عاصمہ ان کے قریب ہونے کے باوجود روز بروز دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ فاصلے گھٹنے کے بجائے بڑھتے جا رہے تھے اور اس احساس نے ثاقب کو بے چین کر دیا۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟" ایک روز دفتر سے واپسی پر انہوں نے عاصمہ کو ناول کی ورق گردانی کرتے دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔

"ناول ہے۔" عاصمہ نے ناول پر نظر جمائے جمائے جواب دیا۔

"کیا بہت زیادہ دلچسپ ہے؟"

"ہوں.........."

"کس نے لکھا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"کوئی رومانی ناول معلوم دیتا ہے۔"

"نہیں۔" وہ کتاب سے نظر اٹھائے بغیر بولی۔ "مجھے رومانی کہانیوں سے کبھی کوئی

دلچسپی نہیں رہی۔"

"رومانی کہانیاں مجھے بھی ناپسند ہیں۔" ثاقب نے مسکرا کر بات بنا دی۔ پھر عاصمہ کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا۔ "کیا آج چائے نہیں پلواؤ گی؟"

"ملازم کو آواز دے لیجئے۔"

"نہیں .... میں تمہارے ہاتھ کی پیوں گا۔" ثاقب نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو وہ کتاب غصے میں پھینک کر اٹھی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ الٹی سیدھی چائے بنا کر لائی اور ثاقب کے سامنے رکھ دی۔

ثاقب کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ عاصمہ صرف ایک پیالی چائے لائی تھی۔ اپنے لئے اس نے چائے نہیں بنائی تھی اور پھر آج ڈھنگ کی چائے بھی نہیں تھی۔ چائے رکھ کر وہ قدم بڑھاتی کھڑکی کے پاس چلی گئی۔

"عاصمہ!" ثاقب نے اسے پکارا۔

"جی!" وہ کسی سوچ میں ڈوبی ڈوبی پلٹی تو ثاقب کے ارمانوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔ عاصمہ کی نگاہوں میں انہیں پیار کی کوئی جھلک نہیں ملی تھی۔

"تم چائے نہیں پیو گی؟"

"نہیں .... میں پی چکی ہوں۔"

"ایک کپ میرے ساتھ بھی پی لو۔"

"خواہش نہیں ہو رہی۔" وہ دوبارہ پلٹ کر باہر دیکھنے لگی۔

ثاقب کا دل تڑپ اٹھا۔ کچھ دیر تک چائے سے اٹھتی بھاپ کے مرغولوں کو لرزتے دیکھتے رہے۔ پھر اٹھ کر عاصمہ کے قریب آ گئے۔

"عاصمہ!" انہوں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اُسے آواز دی۔

"جی .... فرمائیے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے ثاقب کو دیکھا۔

"کیا بات ہے؟ تم کچھ دنوں سے چپ چپ سی ہو۔"

"کوئی بات بھی نہیں ہے۔"

"کیسے مان لوں؟" ثاقب کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔

"نہ مانئے پھر.........." اُس نے بے رخی سے جواب دیا۔

"عاصمہ!" ثاقب نے تڑپ کر اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا پھر اُلجھے

الجھے انداز میں بولے۔ ”خدا کے لئے عاصمہ مجھے اپنی ناراضگی کی وجہ بتا دو۔“

”آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ثاقب!“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”مجھ سے ناراض ہو؟“

”نہیں..........“

”امی جان کی کوئی بات ناگوار گزری ہے؟“

”جی نہیں۔“

”پھر تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ کیوں روٹھ گئی ہے؟“

”چائے ٹھنڈی ہو جائے گی ثاقب!“

”عاصمہ..........!“ ثاقب چیخ اٹھے۔ ”خدا کے لئے مجھے اس بے رخی کا راز بتا دو‘ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

جواب میں وہ بت بنی کھڑی رہی تو ثاقب جھلا کر بولے۔ ”کیا اب تم میری بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرو گی؟“

”جب سوال ہی سمجھ میں نہ آئے تو جواب کیا دوں۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

”پھر تم مجھ سے دور کیوں رہتی ہو؟“

”آپ مجھے بازوؤں سے جکڑ کر قریب کر لیا کریں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”تمہیں اب میری خواہشات کا خیال کیوں نہیں رہتا؟“

”آپ مرد ہیں.......... زبردستی اپنی خواہشات کا احترام کروا لیا کریں۔“

”عاصمہ..........!“ ثاقب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے عاصمہ کو نہیں بلکہ بجلی کے کھلے تاروں کو ہاتھوں میں پکڑ رکھا ہو۔ ذہن کو اتنا شدید جھٹکا لگا کہ اُس نے جلدی سے عاصمہ کو چھوڑ دیا۔

کچھ لمحے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے میں گزر گئے۔ پھر وہ خود پر بھی قابو پا کر بولے۔

”عاصمہ! تم اتنی جلدی بدل کیوں گئی ہو؟“

”میں نے اس کا اظہار تو کبھی نہیں کیا۔“ وہ چبھتے لہجے میں بولی۔

”پھر میں اس تبدیلی کو کیا نام دوں؟“

”وقت کا تقاضا کہہ لیجئے۔“ عاصمہ کے ہونٹوں پر ایک ویران تبسم نے مچل کر دم توڑ

دیا۔

”اگر تمہیں میری کوئی بات ناگوار گزری ہے تو میں اس کے تدارک کو تیار ہوں۔“

وہ خاموش رہی..........

”جان بوجھ کر میں نے تم کو کبھی کوئی دکھ پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔“

اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے..........

”میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنے کا تمنائی ہوں۔“

وہ مہر بہ لب بنی کھڑی رہی‘ کسی بے جان مجسمے کی مانند..........

”کچھ بولو عاصمہ! چپ کیوں ہو؟“

”چائے پیجئے ثاقب!“ اس بار وہ نرم آواز میں بولی۔

”تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

پلکیں اٹھا کر اس نے ثاقب کی نظروں سے جھانکا‘ پیار کے ساغر چھلکتے دیکھے تو دل میں حقارت کا جذبہ کچھ زیادہ شدید ہو گیا‘ لیکن دل پر جبر کر کے مسکرا دی۔ کچھ سوچ کر آج اس نے پھر جھوٹی مسکراہٹ کا سہارا لیا تھا۔ تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ پھر جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کپ اور تھا۔

دونوں خاموشی سے بیٹھے چائے پیتے رہے۔ ثاقب اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ عاصمہ نے اس کی خواہش کو رد نہیں کیا تھا اور عاصمہ سوچ رہی تھی کہ وقت کے تقاضوں نے اسے کس قدر مجبور کر دیا ہے کہ کھل کر بغاوت کا اعلان بھی نہیں کر سکتی..........

چائے پینے کے بعد ثاقب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کپڑے تبدیل کر کے آئے اور عاصمہ سے بولے۔

”چلو.......... کہیں گھومنے چلتے ہیں۔“

”آپ ہو آیئے .... میں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے ثاقب کو دیکھا جو کہیں جانے کے ارادے سے تیار کھڑے تھے۔

”تم کیوں نہیں چلو گی؟“

”مجھے ابھی بہت سارے کام کرنے ہیں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”جلدی واپس آ جائیں گے..........“

"آپ ہر بات میں ضد کیوں کرتے ہیں؟" وہ مجسم سوال بن گئی۔

"اس لئے کہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" ثاقب نے مسکرا کر کہا۔ لہجے اور الفاظ میں بڑی اپنائیت تھی۔

"دفتر میں وقت کیسے گزر جاتا ہے؟"

"وہ ایک مجبوری ہے۔"

"مجبوریاں اور فرض جب دونوں کسی انسان کو جکڑ لیں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟"

"کسی ناول کا مکالمہ۔" ثاقب ہنس دیئے پھر بولے۔ "چلو تیار ہو جاؤ جلدی سے۔ تھوڑی دیر تفریح کرنے سے تمہارے اوپر خوشگوار اثر ہو گا۔"

"خوشگوار اثر........." عاصمہ دل ہی دل میں مسوس کر رہ گئی۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے ایک سادہ سی ساڑھی پہنی اور پرس لئے ثاقب کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"ایک بات کہوں۔" ثاقب نے اسے گھورتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"کہہ ڈالیے' دل میں رکھنے سے گھٹن کا احساس بڑھ جاتا ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"تمہیں کچھ تڑپانے کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

عاصمہ کے نازک نازک ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ جاگ اٹھی۔

"حُسن کا احساس زیادہ ہو گیا ہے شاید!" ثاقب نے قریب آ کر سرگوشی کی تو وہ چپ نہ رہ سکی۔

"احساس ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔"

"مجھے تڑپانے میں کچھ مزہ ملتا ہے تمہیں؟"

"یہ تو وہی بہتر سمجھ سکتا ہے جو تڑپنے کا عادی بن چکا ہو۔" عاصمہ نے دبی زبان میں کہا۔

"بڑے اچھے اچھے جملے بولنے لگی ہو اب تو؟"

"ناول کے مکالمے ہیں۔" وہ تلخ آواز میں بولی پھر قدم بڑھا دیئے۔

ثاقب نے اپنی سبک رفتار کار کو شہر کے ہنگاموں سے نکال کر اس راستے پر ڈال دیا جو

سمندر کی طرف جاتا تھا۔ عاصمہ اس کے برابر بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی۔

وقتی طور پر اس نے ایک بار پھر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ثاقب کے قرب سے نفرت کرنے کے باوجود وہ اس وقت اس کے برابر بیٹھی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے دل کی کربناک چیخ کی آواز ماں کے کانوں تک نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر شبانہ بیگم کو ان باتوں کا علم ہوا تو انہیں صدمہ ہو گا۔ ان کا دل ٹوٹ جائے گا' وہ ماں کے دل کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ماں کی خوشیوں کی خاطر تو اس نے اپنی زبان پر تالے ڈال کر خود کو قربان کر دیا تھا۔ ایک مرد کو شوہر کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اس پر ماں کے حکم کا احترام لازم تھا۔

ماں.........

جس نے مصائب جھیل کر اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا.........

جس نے اپنی زندگی کی بربادی کو بھول کر اولاد کی زندگی کو آباد کرنا چاہا تھا.........

جس کے اپنے ماتھے کا ٹیکہ بِک گیا تھا لیکن اس نے اولاد کی مانگ میں افشاں بھرنے کے سہانے سہانے خواب دیکھے تھے۔

وہ بھلا ماں کے خوابوں کو کیسے ٹھکرا سکتی تھی۔

اور پھر ماں کی خوشیوں کے احترام کے علاوہ بھائی کا مستقبل بھی تو اسی سے وابستہ ہو گیا تھا۔ وہ اس وابستگی کو کیسے ختم کر دیتی۔

ثاقب نے کار ساحل کے ایک پُرسکون گوشے میں روکی تو عاصمہ کے الجھے الجھے خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ دل پر جبر کر کے کار سے نیچے اتر آئی۔ ہوا کے خشک جھونکوں نے بڑھ کر اس کی زلف کو برہم کر دیا تھا۔

"آؤ......... ساحل کے قریب چلتے ہیں۔"

وہ چپ چاپ ثاقب کے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔

"کتنی پُرسکون جگہ ہے یہ۔" ثاقب نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"ہوں........."

"بڑے اختصار سے کام لے رہی ہو۔" ثاقب بولے۔ "کیا پھر اس بات کا احساس جاگ اٹھا ہے کہ بہت حسین ہو۔"

"حسین نہ ہوتی تو آپ مجھے پانے کی تمنا کیوں کرتے؟" وہ مبہم آواز میں بولی۔

"مجھے اپنی تمناؤں کی تکمیل پر فخر ہے۔"

"ثاقب!" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"جی ملکۂ حُسن .... فرمائیے۔" ثاقب نے موڈ میں آ کر کہا۔

"اگر میں آپ کو نہ ملتی تو آپ کیا کرتے؟"

"مجھے اپنے جذبوں پر اعتماد تھا عاصمہ!"

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔"

"اس سوال کی اب ضرورت بھی کیا ہے؟"

"ہے .... جبھی تو پوچھ رہی ہوں۔"

"یقین کر لو گی' میرے جواب پر؟"

"کوشش کروں گی۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

"اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں تمام زندگی یوں ہی گزار دیتا .... کبھی شادی نہ کرتا۔"

"کیوں........؟"

"اس لئے کہ میں تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" ثاقب نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ لہجے میں حقیقت تھی۔

"کیا آپ کو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہے؟"

"بلاشبہ۔"

"اور اگر میں مرگئی تو آپ کیا کریں گے؟"

"عاصمہ........" ثاقب نے تڑپ کر کہا۔ "خدا کے لئے ایسی بری فال منہ سے نہ نکالو۔"

وہ جواب میں مسکرا دی' لیکن اس مسکراہٹ میں اس کی زندگی کی تڑپ بھی شامل تھی۔ روح کی سسک بھی موجود تھی۔ حقارت کا جذبہ بھی جھلک رہا تھا۔ وہ ثاقب کے کہے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہی الفاظ غالباً کبھی اس کے باپ نے اس کی ماں سے بھی کہے ہوں گے۔ اس وقت جب عورت کا حُسن تازہ رہا ہو گا۔ شباب جب وقت کے بے رحم قدموں تلے روندا نہ گیا ہو گا۔ پھول سا چہرہ گردشِ دوراں کی تپش سے کملایا نہ ہو گا........

لیکن ....

جب حُسن کی چمک دمک ماند پڑ گئی' جوانی کا نکھار مٹا اور شباب کی رعنائیاں ختم ہوئیں تو وقت کے ساتھ ساتھ مرد کی نگاہیں بھی بدل گئیں۔ اس کی ماں کو اسی کے بسائے ہوئے گلشن سے کانٹا سمجھ کر نکال پھینکا گیا اور اس کے باپ نے ناہید کی شکل میں ایک تر و تازہ پھول کو اپنی زیست کی ٹہنیوں پر سجا لیا۔

خیالات کا دھارا اسے جانے کہاں سے کہاں بہا لے گیا۔ ماضی کو بھول کر حال کو فراموش کر کے وہ مستقبل کے گھپ اندھیروں میں بھٹک کر رہ گئی۔ سہمے سہمے خیالات نے دل کی دھڑکنوں کو ابھارا تو وہ سوچنے لگی۔

کیا اس کا انجام بھی ماں کی طرح ہو گا........؟

کیا وہ بھی زندگی کے فریب میں الجھ کر یوں ہی لٹ جائے گی۔ کیا اسے بھی سکون کی تلاش میں تمام زندگی موت کا انتظار کرنا ہو گا۔ کیا وہ بھی بگولوں کی طرح بھٹکتی پھرے گی........؟

"عاصمہ .... وہ .... وہ اُدھر دیکھو۔"

ثاقب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ یوں چونک اٹھی جیسے کچی نیند سے بیدار ہو گئی ہو۔ ثاقب جس سمت اشارہ کر رہا تھا اُس نے اُدھر دیکھا۔ دور بہت دور سمندر کی آغوش میں ڈوبتے سورج کا منظر سچ مچ بڑا حسین لگ رہا تھا۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجیں بار بار ابھر کر اسے نگل جانے کے لئے بے چین تھیں اور سورج بار بار ڈوب کر ابھر آتا تھا۔ شاید اسی کشمکش میں اس کا چہرہ بھی خون خون ہو کر رہ گیا تھا۔ جس کی سرخی آسمان کی وسعتوں پر لہرانے لگی تھی۔

"کیمرہ نہیں ہے ورنہ میں .... ڈوبتے سورج کے اس حسین منظر کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتا۔" ثاقب بولے۔

"میں آپ کو اس کی اجازت کبھی نہ دیتی۔"

"کیوں؟"

"انسان کو دوسرے کی مجبوریوں پر کبھی خوش نہیں ہونا چاہئے۔"

"میں قدرت کے نظر فریب مناظر کی بات کر رہا ہوں محترمہ!" ثاقب نے مسکرا کر کہا۔

"پھر بھی .... کسی کے ڈوبنے پر ہنسنا بُری بات ہے۔"

"اچھا محترمہ! غلطی ہو گئی معافی چاہتا ہوں۔" ثاقب نے بڑی سادگی سے کانوں کو ہاتھ لگایا' پھر مسکراتے ہوئے ساحل کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

عاصمہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ ثاقب نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بڑی اپنائیت اور لگاؤ سے گفتگو کر رہے تھے۔ عاصمہ ہوں ہاں کر کے جواب دے رہی تھی۔ پھر ایک بپھری ہوئی لہر تیزی سے کنارے سے ٹکرا کر اوپر آئی تو ثاقب نے جلدی سے پیچھے ہو کر عاصمہ کو بھی کھینچ لیا۔

"ڈر کیوں گئے آپ؟" وہ ہنس پڑی۔

"مجھے ان موجوں سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے ان میں کتنی زندگیاں غرق ہو چکی ہوں گی' لیکن انہیں اب بھی قرار نہیں آتا۔" ثاقب نے سنجیدگی سے کہا تو نہ جانے کیوں وہ قہقہہ لگانے لگی۔

"تم ہنس رہی ہو' میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔"

"میں بھی اس صداقت پر ہنس رہی ہوں جو آپ نے بیان کی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں.........."

"آپ نے ابھی موجوں کی گفتگو کی تھی۔" عاصمہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "واقعی موجوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کون جانے کب کوئی موج کسی زندگی کو غرق کر ڈالے۔"

"تم تو اب فلسفی بنتی جا رہی ہو.........."

"ہر حقیقت ایک فلسفہ ہی ہوتی ہے۔" عاصمہ نے دبی زبان میں کہا۔ پھر لہروں کو دیکھنے لگی۔ جو کس بے چینی سے تڑپ تڑپ کر ساحل تک آتی تھیں پھر کناروں سے ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں۔

جیسے ساحل پر پہنچ کر بھی انہیں قرار نہیں تھا.........

جیسے ان کے مقدر میں کوئی کنارہ رقم نہیں کیا گیا تھا.........

جیسے وہ تمام زندگی یوں ہی تڑپ تڑپ کر ساکت ہو جانے پر مجبور تھیں.........

عاصمہ بڑی دیر تک ساحل پر کھڑی موجوں کو تکتی رہی۔ پھر جب شام کے ملگجی اندھیروں نے اپنا دامن پھیلایا تو سر جھکائے ثاقب کے ساتھ کار تک واپس آ گئی۔ تمام

راستے وہ چپ سی رہی۔ شاید اسے ساحل تک پہنچ کر واپس آ جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

وقت کی رفتار جوں جوں تیز ہوتی گئی عاصمہ کے ذہن میں نفرت کا احساس بھی شدت اختیار کرتا گیا۔ ماں اور بھائی کے خیال سے اُس نے خود پر جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں' ان کی بندشیں بھی آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئیں۔

وہ برف کے تودے سے بے جان پتھر بن گئی۔ اُس نے ثاقب سے اب بیزاری اور بے اعتنائی برتنی شروع کر دی تھی۔ جس آگ میں وہ اب تک تنہا جل رہی تھی اس کے شعلوں کو ہوا دے کر وہ ثاقب کو بھی اب اس کی لپیٹ میں لے لینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صرف تنہا اپنی زندگی کو برباد نہیں ہونے دے گی' بلکہ ثاقب کو بھی اس درد کی تڑپ سے لذت آشنا کرائے گی جو اُس کے وجود میں ایک عرصے سے کچوکے لگا رہا تھا' اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد اس کے اندر اُبلتا ہوا نفرت کا طوفان جیسے پُرسکون ہو گیا تھا۔

اب وہ ہر ہر لمحے ثاقب کو دکھ پہنچا کر جیسے خوشی محسوس کرتی تھی۔ اس کام کو کر کے اسے ایک انجانی مسرت کا احساس ہوتا' جس میں ثاقب کی دل شکنی مقصود ہوتی۔ اگر ثاقب کبھی کہتا کہ سردی ہو رہی ہے کوٹ پہن لو تو وہ جسم پر نظر آنے والا سوئٹر بھی اتار پھینکتی۔ اگر وہ کھانے کا اصرار کرتا تو وہ بھوکی سو رہتی۔ سیر و تفریح کو کہتا تو بڑی سردمہری سے انکار کر دیتی۔ حتی الامکان یہی کوشش کرتی کہ ثاقب سے دور دور رہے۔ اُسے کبھی پاس نہ آنے دے۔

ثاقب محسوس کر رہا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے' لیکن وہ عاصمہ کی ہر نفرت' ہر بے رخی اور ہر بات کو ہنس کر ٹال جایا کرتا تھا۔ اس کے چڑچڑے پن کو محسوس کرتا۔ اس کی بے سروپا باتوں کو سنتا۔ اُس کی دوری سے تلملا اٹھتا' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس نے عاصمہ کو سرزنش کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی' محض اس لئے کہ وہ اُس کی اپنی پسند تھی۔

اپنی پسند.........

جسے اپنانے کے لئے اس نے نہ جانے کتنے حسین خواب دیکھے تھے.........

کتنی آرزوؤں اور کتنی تمناؤں کو بہلایا تھا.........

ایک دو بار اُس نے دبی زبان میں عاصمہ کی خفگی کا سبب جاننے کی کوشش کی' اسے آہستہ سے ٹٹولنا چاہا لیکن پھر جواب نہ پا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ عاصمہ کی نفرت کے جواب میں وہ ہمیشہ اس سے محبت سے پیش آتا رہے گا' لیکن نسیمہ بیگم اتنی بچی نہیں تھیں کہ گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر کے حالات سے واقف نہ ہوتیں۔ انہوں نے جہاں عاصمہ میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو محسوس کیا وہاں ثاقب کی خاموشی بھی ان سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے بذاتِ خود بھی اس بات کو بارہا محسوس کیا تھا کہ بہو کی خدمت گذاری میں کمی آ گئی ہے۔ ہرچند کہ انہوں نے بہو سے اپنی خدمت گذاری کرانے کا خیال نہ کیا تھا۔ خود عاصمہ ہی ان کے بہت قریب آ گئی تھی' لیکن اس اچانک تبدیلی نے انہیں چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا............

ایک روز عاصمہ کسی کام سے ان کے کمرے میں آئی تو نسیمہ بیگم نے دبی زبان میں پوچھا............

"کیا بات ہے بیٹی! تم آج کل کچھ اداس اداس سی نظر آ رہی ہو؟"

"جی نہیں تو .... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے............"

"بغیر بات کے یوں صحت تو نہیں گرا کرتی کسی کی............"

عاصمہ زبردستی مسکرا کر جانے کے لئے گھومی تو نسیمہ بیگم نے اسے آواز دے لی۔

"عاصمہ بیٹی!"

"جی............" اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک سے گئے۔ دل پر قابو پا کر ساس کے قریب آ گئی............

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں............"

"ثاقب سے کوئی بات تو نہیں ہو گئی............"

"جی نہیں۔"

"آج کل وہ بھی بجھا بجھا سا نظر آتا ہے۔" نسیمہ بیگم نے اُسے گھورا۔

عاصمہ جواب دینے کے بجائے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"اپنی صحت کا خیال رکھا کرو بیٹی!"

"جی اچھا۔" وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔

"تمہارے کپڑے بھی میلے ہو رہے ہیں بیٹی! بدل ڈالنا ان کو بھی۔"

"بہت اچھا۔"

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا تو نہیں رہی ہو؟"

"جی نہیں۔"

"میں تمہارے لئے شبانہ بیگم سے کم نہیں ہوں بیٹی۔" نسیمہ بیگم نے کہا۔ "خدا گواہ ہے کہ میں نے تمہیں بھی ثاقب سے کم نہیں سمجھا' اس لئے اگر کوئی بات ہو تو مجھے اپنی ماں سمجھ کر بتا دینا۔"

"کوئی بات نہیں امی حضور!" عاصمہ نے پھر جھوٹ بولا۔

"آج کل موسم بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" نسیمہ بیگم نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ "میری مانو تو ثاقب کو لے کر کچھ دنوں کے لئے کہیں باہر چلی جاؤ۔ صحت بھی ٹھیک ہو جائے گی اور تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" عاصمہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ پھر اٹھ کر ساس کے کمرے سے باہر آ گئی۔

اُس روز وہ تمام دن نسیمہ بیگم کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُس نے ثاقب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی نظرانداز کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ثاقب کی ماں تھیں لیکن آج اسے نسیمہ بیگم کے سلسلے میں اپنی حرکتوں پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ کتنی محبت سے انہوں نے عاصمہ کا دل ٹٹولنے کی کوشش کی تھی۔ کتنے پیار سے اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ ماں بن کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کے درد کو بٹانے کی کوشش کی تھی۔

اس روز عاصمہ نے بہت دن بعد منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا سنگھار بھی کیا تھا۔ نسیمہ بیگم کے بنوائے ہوئے جوڑوں میں سے ایک قیمتی جوڑا پہنا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ثاقب کی طرف سے اپنے دل میں کوئی نرمی کوئی جھکاؤ یا لچک نہیں پیدا ہونے دے گی' لیکن نسیمہ بیگم سے دوبارہ سردمہری کا برتاؤ نہیں کرے گی۔ انہوں نے اس کا بگاڑا بھی کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ پھر وہ کیوں خواہ مخواہ ان سے روٹھ گئی تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح ایک عورت ہی تو تھیں اور عورت کے بارے میں اس کا یہی نظریہ تھا کہ وہ ہمیشہ سے مظلوم بنی رہی ہے۔

خواہ وہ ثاقب کی ماں ہو............

خواہ ساس ہو............

بہن ہو یا بیوی ہو............

شام کو ثاقب کے آنے کا وقت ہوا تو وہ اپنے کمرے سے نکل کر نسیمہ بیگم کے پاس آ گئی۔ نسیمہ بیگم نے بہو کو نکھرا نکھرا پایا تو نہال ہو گئیں۔ پیار سے اُس کی بلائیں لے کر بولیں............

"خدا خوش رکھے تمہیں۔ دیکھو اب کتنی اچھی لگ رہی ہو۔"

"پہلے نہیں تھی کیا؟" وہ بچوں جیسے انداز میں بولی تو نسیمہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

"پہلے بھی تم بہت اچھی تھیں بیٹی! مگر آج تم مجھے چشمِ بددور بہت زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔"

"آج کیا خاص بات ہو گئی ہے امی حضور!"

"تم نے میرے کہنے کی لاج جو رکھ لی۔"

"پہلے میں نے کب آپ کی کسی بات سے انکار کیا ہے۔"

"ماں کی بات سے تو صرف بری لڑکیاں انکار کرتی ہیں۔" نسیمہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

"تم تو میری بڑی پیاری اور سعادت مند بیٹی ہو۔"

عاصمہ نے زیرِ لب مسکرا کر گردن جھکا لی۔ کتنی بے پایاں خوشی ہو رہی تھی اسے اس وقت، ساس کی باتوں میں کتنی مٹھاس تھی جسے پا کر وہ کچھ دیر کے لئے اپنا دکھ درد سب کچھ بھول گئی تھی۔ صرف زندگی کی حلاوتوں میں مدہوش ہو کر رہ گئی تھی۔

"آصف آج کل بہت کم آتا ہے بیٹی! کیا بات ہے؟"

"مصروف رہتا ہے امی حضور!" وہ نرم آواز میں بولی۔ "ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی تو کرنی ہوتی ہے۔"

"خدا اسے ہر امتحان میں کامیاب کرے۔ بڑا نیک لڑکا ہے۔"

"سب آپ ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے آصف پر بہت احسان کیا ہے ورنہ............"

"پھر شروع کر دی تم نے غیریت کی بات۔" نسیمہ بیگم نے کہا۔ "ماں اگر اپنی اولاد کے لئے کچھ کرے تو اُس میں احسان کی کیا بات ہے؟"

عاصمہ کا دل فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا۔

"تمہاری امی کا کیا حال ہے؟" کچھ دیر بعد نسیمہ بیگم نے پوچھا۔ "میں کئی روز سے جا نہیں سکی ان کے پاس۔ نہ جانے کیا سوچتی ہوں گی۔"

"کمزور بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔" عاصمہ نے کہا۔ "ماں کے تذکرے پر اس کا دل پھر ڈول گیا تھا۔

"بڑھاپا سب سے بڑی کمزوری ہے بیٹی! اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ میں تو یہی دعا کرتی ہوں۔" نسیمہ بیگم بولیں۔ "مگر مصیبت تو یہ ہے کہ وہ کسی کا کہنا بھی نہیں سنتیں۔ کتنی بار میں کہہ چکی ہوں کہ آصف کو لے کر یہاں آ جائیں۔ دیکھ بھال بھی قرینے سے ہوتی رہے گی لیکن وہ ہر بار ہوں ہاں کر کے باتوں میں ٹال دیتی ہیں۔"

"انہیں وہ گھر زیادہ عزیز ہے۔" عاصمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ثاقب نہیں آئے ابھی تک۔" نسیمہ بیگم نے بہو کی نظروں میں نمی دیکھی تو جلدی سے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"میرا خیال ہے کہ امی کو دوبارہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔" عاصمہ نے ساس کی بات جیسے سنی ہی نہ تھی۔

"کیوں، خیریت تو ہے؟"

"سینی ٹوریم کے بڑے ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا کہ ہر چھ ماہ بعد امی جان کا ایکسرے ہونا ضروری ہے۔"

"یہ کون سی ایسی دشوار بات ہے۔ میں ثاقب سے کہوں گی کہ کسی دن کار میں لے جا کر ایکسرے کرا لائے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" وہ جلدی سے بولی۔ میں نے آصف سے کہہ دیا ہے۔ اب کی اتوار کو وہ امی کو سینی ٹوریم لے جائے گا۔"

"ثاقب کی بات اور ہے بیٹی، وہ ڈاکٹر سے بات بھی کر لے گا۔" نسیمہ بیگم نے کہا۔

"آصف پھر بھی ابھی بچہ ہے۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں کی کمزوری اور بیماری کے خوف سے وہ سہم گئی تھی۔ کتنے ہی لمحے بڑی خاموشی سے گزر گئے۔ نسیمہ بیگم بہو کی دلی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں۔ کچھ سوچ کر بولیں۔

"میں کل کسی وقت جاؤں گی تمہاری امی کے پاس۔"

"کوئی کام یاد آ گیا ہے کیا؟"

"کام کیا ہو گا' بس یہی سمجھاؤں گی کہ اپنی ضد چھوڑ کر تمہارے پاس آ جائیں۔ تمہارا دل بھی بہلا رہے گا۔"

"امی جان کا اس پر تیار ہونا مشکل ہی ہے۔"

"زبردستی کی بات ہے' ورنہ مجھے تو بے حد خوشی ہو گی۔ تمام دن اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہوں' وہ آ جائیں گی تو میرا وقت بھی کٹ جایا کرے گا۔"

عاصمہ خاموش رہی تو نسیمہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ وہ کیوں یہاں آنے سے انکار کرتی ہیں؟ داماد کے پاس رہنا شاید انہیں گوارا نہیں ہے لیکن اگر وہ ایسا سمجھتی ہیں تو ان سے اخراجات لے لیا کروں گی تاکہ ان کے دل پر کوئی بوجھ نہ ہو۔"

عاصمہ بھی مسکرا دی' لیکن کسی کے قدموں کی مانوس سی آہٹ دروازے پر ابھری تو وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ یوں جیسے بہار کے موسم پر اچانک خزاں کے سائے لہرا گئے ہوں۔

ثاقب نے دروازے پر قدم رکھا تو چونک اٹھے۔ عاصمہ کے بدلے ہوئے حلئے کو دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوئی تھی۔ آج اُس نے وہی جوڑا پہن رکھا تھا جو ثاقب کو بھی بہت پسند تھا۔ آج اُس نے چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ بھی کیا تھا۔ بکھرے بکھرے بال آج سنورے سنورے نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر وہ اداسی اور نفرت بھی نہیں تھی جسے دیکھ کر ثاقب بجھ سے جاتے تھے۔

کچھ دیر دروازے پر کھڑے وہ عاصمہ کی اس اچانک تبدیلی پر غور کرتے رہے۔ پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور ماں کے قریب بیٹھ گئے۔ عاصمہ نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ نسیمہ بیگم کی ذوربین نظروں نے محسوس کر لیا کہ ثاقب کے آتے ہی بہو کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی ہے۔ ورنہ کچھ دیر پہلے وہ ان سے باتوں میں مصروف تھی۔

"کیا میرے خلاف کوئی سازش ہو رہی تھی؟" ثاقب نے ماں سے پوچھا' پھر عاصمہ کو دیکھنے لگے۔

"سازش کیسی؟"

"پھر میرے آتے ہی آپ لوگ چپ کیوں ہو گئیں۔"

"تم کون ہوتے ہو ماں بیٹی کی باتوں کو کریدنے والے؟" نسیمہ بیگم نے بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اور کیا میں آپ کا کوئی نہیں ہوں؟"

"ہو کیوں نہیں' مگر بیٹیوں کا زیادہ حق ہوتا ہے۔"

ثاقب مسکرا دیئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ماں کس انداز میں حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے نظر بھر کر عاصمہ کو دیکھا جو اب بھی اپنے آپ میں گم بیٹھی تھی۔

"کیا آج چائے کا ناغہ ہے امی جان!" ثاقب نے عاصمہ کو دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔

"ملازم سے کہو بنا کر لا دے گا۔" نسیمہ بیگم نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ "میری بیٹی تمہارے لئے چائے نہیں بنائے گی۔"

"میں نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ یہاں میرے خلاف کوئی سازش ہو رہی تھی۔"

"سازش کی بات نہیں ہے ثاقب' لیکن تم اب بہت برے ہوتے جا رہے ہو۔"

"میں نے کیا کیا امی جان؟"

"تم میری بیٹی کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔ دیکھو تو اس کی صحت کتنی گر گئی ہے' اور تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ کسی ڈاکٹر کو دکھا دیتے۔"

"آپ ناراض نہ ہوں امی جان! میں اسی وقت آپ کے حکم کی تعمیل کئے دیتا ہوں۔"

"بس رہنے دو تم اپنی محبت۔" نسیمہ بیگم بولیں۔ "میں خود اب اپنی بیٹی کا خیال رکھوں گی۔"

"گویا اب آپ کے دربار میں بھی میری شنوائی مشکل ہے۔" ثاقب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

عاصمہ اپنی جگہ سے ٹس سے مَس بھی نہ ہوئی۔ بت بنی چپ چاپ بیٹھی ماں بیٹے کی گفتگو سنتی رہی۔

"تمہاری شنوائی اسی وقت ہو گی جب میری بیٹی تمہاری سفارش کرے گی۔"

"کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے؟" ثاقب نے شوخی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر تو اب خوشامد کرنی پڑے گی۔" ثاقب نے عاصمہ کی سمت دیکھا۔ روٹھی روٹھی سی عاصمہ انہیں اس وقت بڑی حسین لگ رہی تھی۔ دراز دراز پلکیں آنکھوں پر چلمن کئے وہ بڑے پیارے انداز میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"کسی وقت جا کر اپنی ساس کو بھی دیکھ آنا۔"

"خیریت..........!" ثاقب نے جلدی سے پوچھا۔ "انہیں کیا ہو گیا؟"

"ابھی عاصمہ نے بتایا ہے کہ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔"

"میں تو بارہا کہہ چکا ہوں کہ کسی وقت چل کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیں' لیکن وہ نہ جانے کیوں ٹال جاتی ہیں۔"

"تم انہیں ٹالنے ہی کیوں دیتے ہو۔ اصرار کر کے لے جاؤ کسی ڈاکٹر کے پاس' اور اگر پھر بھی وہ آمادہ نہ ہوں تو ڈاکٹر کو گھر لا کر دکھا دو۔"

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" ثاقب نے کہا' پھر عاصمہ سے بولے۔ "تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

"جی۔" وہ یوں چونکی جیسے اس نے سرے سے ثاقب کی بات نہ سنی ہو۔

"میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ زیادہ مناسب رہے گا کہ کسی ڈاکٹر کو انہیں گھر بلا کر دکھا دیا جائے۔"

"میں آصف سے کہہ چکی ہوں۔" اُس نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"آصف کیا کرے گا بھلا' ہم دونوں مل کر اصرار کریں گے تو کام آسانی سے ہو جائے گا۔" ثاقب نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"کچھ روگ ایسے ہوتے ہیں جو ڈاکٹروں کے علاج سے بھی دور نہیں ہوتے۔" عاصمہ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔" ثاقب بولے۔ "قبل از وقت کسی مریض کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"درست ہے' مگر اکثر مریض ڈاکٹر سے زیادہ اپنے مرض کو سمجھتے ہیں۔" عاصمہ نے جواب دیا۔ ماں کے دکھوں اور اپنی بے بسی کا احساس جاگا تو اس کی پلکوں کے گوشے بھیگ

گئے۔

"مایوسی گناہ ہے بیٹی!" نسیمہ بیگم نے بڑے پیار سے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا نے چاہا تو حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"میں ابھی آصف کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو بلائے لاتا ہوں۔" ثاقب نے بیوی کی پلکوں پر تھرتھراتے شبنمی قطرے دیکھے تو بے چین ہو کر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"رہنے دیجئے' اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

"کیوں نہیں ہے جلدی۔ جاؤ ثاقب تم ابھی کسی ڈاکٹر کو لا کر دکھا دو۔" نسیمہ بیگم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو عاصمہ کچھ نہ بولی۔ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ ساس کی باتوں سے اسے اپنائیت کا احساس ہوا تو دل کے چھالوں میں جیسے ٹھیس لگ گئی' ہمدردی کے دو الفاظ ہی سن کر اس کا دل بھر آیا تھا۔

جب ثاقب کمرے سے چلے گئے تو دل میں سویا ہوا طوفان آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا اور وہ نسیمہ بیگم کے سینے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

ثاقب نے جس خلوص اور محبت سے شبانہ بیگم کی بیماری پر توجہ دی تھی اس کا احساس سب ہی کو تھا' لیکن عاصمہ احسانوں کے بوجھ تلے دب کر اور سسک سسک کر مر جانے کا ارادہ ترک کر چکی تھی۔ نسیمہ بیگم کا منہ دیکھ کر وہ ثاقب کو ماں کے علاج کے لئے منع نہ کر سکی تھی' لیکن اگلے ہی روز اس نے آصف کو آڑے ہاتھوں لے ڈالا۔ ثاقب کے لئے اس کے دل میں جو غبار تھا وہ بیچارے آصف پر اتر گیا۔

اس وقت آصف شام کے کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا جب عاصمہ جھلائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ آصف نے بہن کو دیکھا تو خوش ہو کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ بڑے پیار سے بولا۔

"آپی! بڑی عمر ہے آپ کی' میں ابھی آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔"

"ثاقب نے تمہیں کوئی نیا عہدہ دلا دیا ہے شاید؟" عاصمہ نے چڑچڑے پن سے کہا۔

"یہ بات نہیں آپی بلکہ.........."

"پھر تمہیں ثاقب کی تعریف کرنی ہو گی.......... کیوں؟"

"آپی!" آصف نے حیرت سے بہن کے چہرے کو دیکھا۔

"مر گئی تمہاری آپی!" عاصمہ بپھر کر بولی۔ "اگر تمہیں میری عزت کا خیال ہوتا تو میری مرضی کے خلاف کوئی قدم کبھی نہ اٹھاتے۔"

"میں سمجھا نہیں آپی!" آصف نے پلکیں جھپکاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"سمجھ بھی نہیں سکو گے آصف' اس لئے کہ اب تم کو افسری کی کرسی مل گئی ہے۔" وہ ہونٹ کاٹ کر بولی۔

"آپی! میرا قصور کیا ہے؟"

"تمہارا قصور صرف اتنا ہے کہ اب تم بڑے آدمی بن گئے ہو' اور مرد جب اپنی حیثیت سے زیادہ پالیتا ہے تو اس کے احساسات مرجاتے ہیں وہ کسی دوسرے کے جذبات کا نہیں صرف اپنی مرضی کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔" عاصمہ جذبات کی رَو میں بہہ کر کہے جارہی تھی۔

"کل تک تمہیں بھی اپنی آپی کے احساسات وجذبات کا بے حد احترام تھا۔ تم ہمیشہ میری نظروں کے اشارے پر چلتے تھے۔ میرے حکم کی تعمیل کو اپنا ایمان سمجھتے تھے' لیکن اب تم بھی بدل گئے ہو .... ہاں آصف! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔ اب تمہیں بھی اپنی بہن کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تمہیں میری عزت اور میرے وقار کا کوئی لحاظ باقی نہیں رہا۔ شاید اس لئے کہ تم بھی مرد ہو........"

"آپی!" آصف کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

"نہیں آصف! آئندہ سے تم مجھے آپی نہیں کہو گے۔ کوئی اور نام رکھ لو میرا۔ کوئی بھی نام جو پسند ہو۔" عاصمہ جو کل تک آصف کے لئے شبنم تھی آج شعلہ کا روپ اختیار کرکے بھڑک اٹھی........

"آپی!" آصف دوڑ کر بہن سے لپٹ گیا۔ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "خدا کے لئے آپی ایسا مت کہو' مجھے صرف میرا قصور بتا دو۔"

عاصمہ کی نفرت کا احساس کانپ اٹھا۔ بھائی کی نمناک آنکھوں میں لرزتے آنسو دیکھ کر بہن کا جذبہ محبت جوش میں آگیا۔ اس نے بس ایک لمحے کے لئے آصف کی نگاہوں میں جھانک کر دیکھا پھر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر خود بھی کسی لبریز پیمانے کی طرح چھلک پڑی۔

آنسوؤں کا سیلاب تھما تو وہ نرم آواز میں بولی۔

"امی کے لئے ڈاکٹر کون لایا تھا۔"

"ثاقب بھائی۔"

"تمہیں دوسروں کو اتنا موقع نہیں دینا چاہئے تھا آصف!"

"لیکن ثاقب بھائی غیر کب ہیں آپی!"

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ خود جاکر امی کو دکھا لانا۔" عاصمہ بولی۔ "ثاقب لاکھ تمہارے لئے مہربان سہی' لیکن امی جان پر میں ان کا کوئی احسان پسند نہیں کرتی۔"

"آپ اتنی سی بات پر مجھ سے خفا ہوگئی تھیں۔"

"ہاں' آئندہ تمہیں میری باتوں کا احساس کرنا ہوگا' ورنہ پھر میں تم سے روٹھ جاؤں گی۔" وہ بھائی کو اپنے احساسات سے واقف کرانا چاہتی تھی لیکن کھل کر کچھ نہ کہہ سکی۔

"ڈاکٹر کی فیس تو میں نے دی تھی۔" آصف بولا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" عاصمہ کو روحانی خوشی محسوس ہوئی۔

"آپی! ایک بات پوچھوں۔"

"کیا؟"

"آپ ثاقب بھائی سے ناراض ہیں کیا؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آصف! تمہیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔" وہ خشک لہجے میں بولی' پھر قدم بڑھاتی ماں کے کمرے میں آگئی۔

شبانہ بیگم اپنے بستر پر لیٹی نہ جانے کس خیال میں محو تھیں جو انہیں عاصمہ کی آمد تک کا احساس نہ ہوا۔ وہ دروازے پر رک کر ماں کو دیکھنے لگی۔ کتنی لاغر ہوگئی تھیں وہ۔ چہرے کی جھریاں اس ماضی کی نشاندہی کر رہی تھیں جس میں ان کا سہاگ لٹ کر رہ گیا تھا۔ ویران ویران سی آنکھوں میں حسرت ویاس کی نہ جانے کتنی کہانیاں مچل رہی تھیں۔ چھت پر نظریں جمائے وہ اپنے خیالوں میں گم تھیں۔

ماں کو اس حالت میں دیکھ کر عاصمہ کے ذہن میں جھناکے گونج اٹھے۔ اس نے اس لئے تو ماں کی خوشیوں کا احترام نہیں کیا تھا کہ وہ خود اندھیروں میں کھو کر رہ جائیں۔ اس نے تو ماں کو خوش رکھنے کے لئے اپنے ارمانوں کی قربانی دی تھی۔ اپنی زندگی کو گھپ اندھیروں میں غرق کرکے اس نے ماں کی زندگی کو اُجالوں میں مسکراتا دیکھنے کی آرزو کی تھی۔

لیکن ....

اس کی آرزوئیں پامال ہو کر رہ گئی تھیں ....

اس کے خواب آج بھی ادھورے نظر آ رہے تھے ....

اس کی قربانی رائیگاں ہوتی نظر آ رہی تھی ....

عاصمہ تڑپ کر رہ گئی۔ کچھ دیر دروازے پر ساکت و جامد کھڑی ماں کے چہرے پر لہراتے سایوں کو تکتی رہی۔ پھر ایک آہ سرد بھر کر آگے بڑھی اور ماں کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

"عاصمہ!" شبانہ بیگم نے بیٹی کو دیکھا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر بولیں۔ "تم کب آئی؟"

"ابھی تو آئی ہوں امی! آصف کے پاس تھی۔"

"نسیمہ بیگم بھی آج آئی تھیں مجھے دیکھنے۔ دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔"

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گئی تھی۔"

عاصمہ ماں کے اس خوبصورت جھوٹ پر اندر ہی اندر مسوس کر رہ گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ ماں کے سینے میں ایک طوفان چھپا ہوا ہے۔ ماضی کا طوفان' جس نے حال کی خوشیوں کو بھی اپنی آہنی گرفت میں لے کر سسکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی ماں کی ممتا کو زبردستی مسکراتا دیکھ رہی تھی۔

"کل رات ثاقب ڈاکٹر کو لائے تھے۔" شبانہ بیگم نے کہا۔ "اس بیچارے کو میرا بڑا خیال رہتا ہے۔"

"ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"کمزوری ظاہر کی ہے۔ کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں۔"

"امی جان!" عاصمہ نے پلکوں کی اوٹ میں مچلتے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ "آصف کو ابھی آپ کی ضرورت ہے' اپنے لئے نہ سہی' اسی کے لئے اپنی صحت کا خیال رکھا کیجئے۔"

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں بیٹی!" شبانہ بیگم نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ "تم لوگ تو خواہ مخواہ ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہو۔"

عاصمہ نے ماں کی آنکھوں میں تڑپتی حسرتوں کو دیکھا تو تڑپ کر رہ گئی۔

"تم تو خوش ہو نا بیٹی!"

"جی ہاں..........."

"ثاقب کہہ رہے تھے کہ تم آج کل کچھ اداس اداس سی رہتی ہو۔"

"انہوں نے یوں ہی کہہ دیا ہو گا ورنہ مجھے بھلا کس چیز کی کمی ہے۔" عاصمہ بولی۔ وہ ماں کے سامنے اپنے جذبات بیان کر کے انہیں مزید دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔

"کوئی بات ہو تو مجھے بتا دو۔"

"کوئی بات نہیں ہے امی جان!" اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

آصف چائے کی ٹرے ہاتھوں میں تھامے اندر داخل ہوا تو عاصمہ نے جلدی سے اٹھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پھر چائے بنانے لگی۔

"تم اپنی پڑھائی کی طرف سے غافل تو نہیں ہو۔" چائے کا کپ آصف کو دیتے ہوئے اُس نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

"پڑھائی کی طرف سے میں کبھی غافل نہیں ہو سکتا آپی!" آصف بولا۔ "میں نے آپ سے وعدہ جو کر لیا ہے۔"

"اگر تم اوّل نہ آئے تو مجھے دکھ ہو گا۔" اُس نے دوسرا کپ ماں کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو ان شاء اللہ اوّل آ کر دکھاؤں گا۔"

"دفتر کا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"اپنی ذمہ داریوں سے کبھی کوتاہی نہ برتنا۔" وہ چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولی۔

"مجھے ہمیشہ اس کا احساس رہتا ہے۔"

"امی کی دوائیں لے آئے تم؟"

آصف نے ماں کی طرف دیکھا تو شبانہ بیگم جلدی سے بولیں۔

"میں نے آصف کو دوا لانے سے منع کر دیا تھا بیٹی!"

"منع کر دیا تھا........... کیوں؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"تھکن سی ہے جاتی رہے گی۔ دواؤں میں پیسے برباد کرنے سے کیا فائدہ؟"

"امی جان! کیا آپ میری خوشی کی خاطر بھی ڈاکٹر کے کہنے پر عمل نہیں کریں گی؟"

"دواؤں پر مجھے اعتقاد نہیں رہا بیٹی! ورنہ ضرور منگوا لیتی۔" شبانہ بیگم نہ جانے کس جھونک میں اپنی کیفیت بیان کر گئیں۔ غلطی کا احساس ہوا تو جلدی سے بات بنانے کی خاطر بولیں۔ "تم میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لینا بیٹی! میرا مطلب صرف یہ تھا کڑوی کسیلی دوائیں پی کر میرا جی اور خراب ہونے لگتا ہے، لیکن تم کہتی ہو تو کل ہی ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوائیں منگوا لوں گی۔"

"کل نہیں آج ہی۔" عاصمہ نے کہا۔ پھر اسی وقت اس نے آصف کو بھیج کر بازار سے دوائیں منگوائیں۔ اپنے ہاتھ سے ماں کو ایک خوراک دی۔ پھر جاتے وقت ماں کو اس نے اپنی زندگی کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ وہ دواؤں کی طرف سے لاپرواہ نہ ہوں۔

آصف بہن کو چھوڑنے کے لئے ساتھ ساتھ باہر آیا تھا۔ عاصمہ نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ وہ چپ چپ سا ہے لیکن اس کی وجہ اسے معلوم تھی، اس لئے اس نے آصف کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر پہنچ کر صرف اتنا کہا تھا۔

"آصف! تم میری باتوں کا کوئی اثر نہ لینا۔"

"آپی! کیا آپ آج کچھ پریشان ہیں؟"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے آصف! بس امی کی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔"

"آپ نے اگر مجھ سے کوئی بات چھپائی تو مجھے دکھ ہو گا آپی!" آصف نے دبی زبان میں کہا۔ "ابھی آپ کا بھائی زندہ ہے اس لئے.........."

"خوش رہو میرے بھیا!" عاصمہ نے جلدی سے کہا۔ پھر آصف کو رخصت کرتے ہوئے بڑی تاکید سے بولی۔ "امی کی دوا اور ان کے علاج کا خیال رکھنا، میں بھی آتی رہوں گی۔"

آصف کو دروازے سے رخصت کر کے وہ سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی اور بڑی دیر تک بیٹھی ماں کے بارے میں سوچتی رہی۔ کمرے میں تاریکی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن اس نے بتی جلانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ جب روح کی گہرائیوں میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا تو پھر اسے اس عارضی اندھیروں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم صم بیٹھی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی..........

رات اس نے سر درد کا بہانہ کر کے کھانا بھی نہیں کھایا، بھوکی سو گئی۔ دوسرے دن

بھی وہ پریشان رہی۔ وہ زندگی کے اس شیرازے کو بکھیرنا نہیں چاہتی تھی جو شبانہ بیگم نے اب تک منتشر ہونے سے بچا رکھا تھا۔

کئی دن انہی سوچوں میں گزر گئے، اور پھر ایک دن وہ یوں کانپ اٹھی جیسے زندگی میں اچانک کوئی انقلاب آنے والا ہو۔ اس روز اسے صبح سے دو بار قے ہو چکی تھی، اور جی تھا کہ متلائے جا رہا تھا۔ وہ اپنی کیفیت کے اس اچانک تغیر کو سمجھ نہ سکی تھی، لیکن نسیمہ بیگم کے الفاظ اس کے ذہن پر کھولتے ہوئے تیل کی طرح گرے تھے اور اس کے ذہن کو جلا کر راکھ کر گئے۔ انہوں نے عاصمہ کی حالت دیکھ کر کہا تھا۔

"خدا نے چاہا تو اب تمہاری تنہائی دور ہو جائے گی۔"

وہ مطلب نہ سمجھ کر ساس کے چہرے کو تکنے لگی تو وہ مسکرا کر بولیں۔

"ثاقب آ جائے تو جا کر کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھا دینا۔ ابھی سے دیکھ بھال کی ضرورت ہے تاکہ بچہ صحت مند ہو۔"

اور عاصمہ پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔ شرم سے سر جھکا لینے کے بجائے وہ نسیمہ بیگم کو یوں گھورنے لگی جیسے انہوں نے اُسے کوئی گالی دے دی ہو............

تمام دن وہ بجھی بجھی سی رہی۔ یہی سوچتی رہی کہ کیا وہ اس زبردستی کے سودے کے انجام کو برداشت کر لے گی۔ کیا وہ مرد کے مظالم کی نشانی کو سینے سے لگا کر خوش رہے گی۔

شام کو ثاقب دفتر سے واپس لوٹے تو وہ ایک اہم فیصلہ کر کے کھل کر ان کے سامنے آ گئی۔

"مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیوں، کیا طبیعت کچھ خراب ہے؟" ثاقب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہیں.........."

"پھر لیڈی ڈاکٹر کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"میں ماں بننا نہیں چاہتی۔" وہ دل کڑا کر کے بولی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو عاصمہ!" خوشی کے جذبے سے سرشار ہو کر ثاقب نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

"نہیں' میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" عاصمہ نے سختی سے کہا اور تڑپ کر ان بازوؤں کے حصار سے نکل گئی جو ابھی تک اسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔

ثاقب حیرت اور حسرت کے ملے جلے جذبے سے مغلوب کھڑے عاصمہ کو گھور رہے تھے۔ کچھ دیر بعد قریب جا کر بولے۔

"عاصمہ!" ان کی آواز میں شبنم کی سی نرمی اور مٹھاس تھی' لیکن عاصمہ منہ پھیرے کھڑی رہی۔

"عاصمہ! تم نے آج مجھے میری زندگی کی سب سے عظیم خوشخبری سنائی ہے۔ آج میں بے حد خوش ہوں بلکہ تمہارا احسان مند بھی ہوں۔"

عاصمہ چپ چاپ کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی۔

"کیا تم کو کوئی خوشی نہیں ہے؟"

عاصمہ نے پوری قوت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ہم دونوں مل جل کر اپنے کھلونے سے کھیلا کریں گے۔ کیوں؟" ثاقب نے اُس کے اور قریب آ کر کہا تو عاصمہ نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے جیسے وہ ان باتوں کو سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

"عاصمہ!" ثاقب برداشت نہ کر سکے تو چیخ اٹھے۔ عاصمہ کی حرکتوں نے انہیں تڑپا دیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اسے تھام کر سخت لہجے میں بولے۔ "آنے والے مہمان پر صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ میرا بھی کچھ حق ہے۔"

"میں اپنی زندگی پر کسی کا کوئی حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" وہ طوفان کی طرح پھٹ پڑی۔

"تم پاگل ہوگئی ہو عاصمہ.......... ذرا سوچو تو سہی کہ.........."

"میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی.......... کچھ سمجھنا نہیں چاہتی ثاقب! مجھے میری حالت پر چھوڑ دو.......... تمہیں خدا کا واسطہ۔" وہ شعلہ کی مانند بکھر گئی۔

"میں تمہیں کسی معصوم پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" ثاقب نے ایک بار پھر عاصمہ کو اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہا تو وہ آتش فشاں کی طرح اُبل پڑی اور بڑی حقارت سے بولی..........

"ظلم ہر حالت میں ظلم ہوتا ہے' خواہ کسی معصوم کی گردن پر ہو یا سمجھدار کی زندگی پر۔"

"تم سچ مچ دیوانی ہوگئی ہو عاصمہ!" ثاقب تلملا کر رہ گئے۔

"ہاں' میں دیوانی ہوگئی ہوں' اور دیوانوں سے ہوشمندی کی توقع کبھی نہیں کرنی چاہئے۔" اس نے نفرت سے منہ پھیر کر کہا پھر تیزی سے کمرے سے باہر آگئی۔

وہ رات اس نے احساسات کے کانٹوں پر تڑپ تڑپ کر گزاری تھی۔ ثاقب تمام رات اس کے قریب بیٹھے اسے سمجھاتے رہے۔ کبھی نرمی سے اور کبھی گرمی سے۔ کبھی وہ سیمابی کیفیت کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتے اور کبھی عاصمہ کی منت سماجت کرنے لگتے۔

لیکن..........

عاصمہ مہر بہ لب بنی رہی..........

اس نے ثاقب کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی..........

اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی رہی..........

اور.......... اور..........!

وہ رات ان دونوں ہی نے پلکوں کے نیچے سے گزار دی۔

☆======☆======☆

ناہید نے شہباز کو روبی کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو حقارت سے منہ پھیر کر دوسری میز کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ شہباز سے کبھی گفتگو نہیں کرے گی۔ اسے اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔

شہباز نے ناہید کو دیکھا تو بڑے طنز بھرے انداز میں مسکرایا۔ پھر اس نے روبی سے اپنے لئے ایک ڈبل پیگ بنانے کو کہا اور سگریٹ جلا کر اس کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔

"کیا بات ہے ڈیئر!" روبی نے گلاس بھر کر شہباز کی سمت بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "ناہید کو دیکھ کر تم مسکرائے کیوں تھے؟"

"اس لئے کہ وہ مجھے دیکھ کر آگے بڑھ گئی تھی۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"وقت آنے دو' تم خود بخود سمجھ جاؤ گی۔" شہباز نے گلاس پر انگلیاں جماتے ہوئے

کہا۔ ”میں نے ناہید سے زیادہ حسین اور خوبصورت لڑکیاں بھی دیکھی ہیں جو جوانی کے نشے میں سرشار دلوں کو روندتی ہوئی چلنے کی عادی تھیں‘ لیکن وقت نے اُن کے غرور کو بھی خاک میں ملا دیا۔“

”فلسفیانہ باتیں مت کیا کرو ڈیئر! مجھے الجھن سی ہوتی ہے۔“

شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گلاس خالی کر کے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر جاگتے ہنگاموں کا جائزہ لینے لگا۔

کلب کی رونق آج بھی روزِ اوّل کی طرح جوان جوان نظر آ رہی تھی۔ جانے پہچانے اور دیکھے بھالے چہرے آج بھی خوابیدہ خوابیدہ ماحول میں اپنے قہقہے بکھیر رہے تھے۔ رنگین آنچل آج بھی لہراتے نظر آ رہے تھے‘ اور ان آنچلوں سے پھوٹتی ہوئی خوشبو ماحول کو معطر کر رہی تھی اور اس معطر معطر ماحول میں ناہید کی موجودگی نے شہباز کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ متعدد بار اسے کنکھیوں سے دیکھ چکا تھا‘ لیکن ناہید یوں بے نیاز سی بیٹھی تھی جیسے اسے شہباز کے دل میں مچلتے ہوئے ارمانوں سے متعلق کوئی واقفیت نہ تھی۔

شہباز نے پانچواں گلاس ختم کیا تو اس کی نظروں کے سامنے کہکشاں سی چمک اٹھی۔ قوسِ قزح کے رنگ لہرانے لگے اور اس کیفیت میں ناہید اسے پہلے سے زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ دھانی رنگ کی ساڑھی میں وہ اسے پرستان کی سب سے خوبصورت شہزادی لگ رہی تھی.........

بڑی بڑی خوبصورت اور نشیلی آنکھیں.........

گھنیری پلکیں جو بار بار آنکھوں پر چلمن ہوئی جا رہی تھیں.........

گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک ہونٹ.........

کتابی چہرہ اور کھلتی ہوئی رنگت.........

بھرے بھرے گداز بازو.........

دراز دراز زلفیں جو شانوں پر بکھری نظر آ رہی تھیں.........

کانوں میں لٹکے ہوئے آویزے جو روشنی میں دمک رہے تھے.........

گلے میں جھلملاتا ہوا خوبصورت نیکلس جو جلد کی رنگت سے جلا پا رہا تھا.........

اور شہباز کو یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت کی تمام رنگینیاں اور حسن سمٹ کر ناہید کے پیکر میں سما گئے ہیں یا پھر ممکن تھا کہ اس کی اپنی تشنگی کے احساس نے ناہید کو اس کے لئے

زیادہ حسین بنا کر پیش کر دیا ہو.........

شہباز اپنی جگہ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ دولت کے بل بوتے پر اس نے آج تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کو پامال کیا تھا۔ جانے کتنے مہکتے پھولوں کو لچکتی ٹہنیوں سے توڑ کر ان کی خوشبو سونگھی تھی اور پھر انہیں خاک میں ملا دیا تھا‘ لیکن ناہید کے سلسلے میں اسے پہلے ہی قدم پر منہ کی کھانی پڑی تھی اور شکست کے اس احساس پر وہ بل کھا کر رہ گیا تھا۔ اسے ناہید کی نفرت پر کوئی افسوس نہ ہوتا اگر پرنس اکبر کی شخصیت درمیان میں نہ آتی‘ لیکن یہ بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ پرنس اکبر سے زیادہ دولت مند ہونے کے باوجود ناہید اُس کی دسترس سے باہر نکل جاتی.........

”کہاں کھو گئے ہو ڈیئر!“ روبی نے اس کی خاموشی سے اکتاتے ہوئے کہا۔

”کھویا نہیں ہوں بلکہ کچھ پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”پھر وہی فلسفہ۔“ روبی نے بُرا سا منہ بنایا۔

”فلسفہ سے چڑتی کیوں ہو؟“ شہباز نے بھاری لہجے میں کہا۔ ”زندگی بذات خود بھی تو ایک فلسفہ ہے۔ رنگین فلسفہ جو کبھی تمہاری صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی ناہید کا روپ اختیار کر کے احساسات کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے.........“

”ناہید بہت بُری طرح تمہارے اعصاب پر سوار ہے؟“ روبی مسکرائی۔

”ہاں‘ صرف اس وقت تک جب تک میں اس کے غرور کا سر نیچا نہیں کر لوں گا۔“

”سنا ہے آج کل وہ پرنس اکبر کی داشتہ بنی ہوئی ہے۔“

”وقتی باتوں کا اثر لینا میرے اصول کے خلاف ہے۔“ شہباز نے سگریٹ کا کثیف دھواں منہ سے اُگلتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک زمانے میں تم بھی تو قاسم سیٹھ کی منظورِ نظر بنی ہوئی تھیں......... لیکن آج.........“

”شہباز!“ روبی کا موڈ جیسے یکلخت خراب ہو گیا۔ تنک کر بولی۔ ”میں تم کو کئی بار منع کر چکی ہوں کہ پرانی باتیں نہ کریدا کرو۔“

”آنچ جب اپنے جسم پر محسوس ہو تو زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔“ شہباز بولا۔ ”رہا پرانی باتوں کا سوال تو منہ سے نکلنے والی ہر بات پرانی ہو جاتی ہے۔“

”ڈانس کا پروگرام نہیں ہے کیا؟“ روبی نے موضوع بدلنا چاہا۔

”نہیں......... ویسے تم چاہو تو کسی اور کو پارٹنر بنا لو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

"آج کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے شاید؟"

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔" شہباز نے کہا۔ پھر اس نے کنکھیوں سے ناہید کی طرف دیکھا جو اپنی میز پر بیٹھی تنہا پی رہی تھی۔

"پرنس اکبر کے ساتھ مل جاؤ تو تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"روبی!" شہباز زخمی انداز میں تڑپ کر بولا۔ "تم اسی وقت دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔"

"شہباز ڈیئر! تم تو ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہو.........."

"پھر بھی تم اس وقت اٹھ جاؤ یہاں سے ورنہ.........." شہباز نے جملہ نامکمل چھوڑ کر سرخ سرخ آنکھوں سے روبی کو گھورا تو وہ سہم کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہباز نے نفرت سے ہونٹ کاٹے۔ پھر اپنے لئے نیا جام تیار کرنے لگا۔ روبی کے ایک ہی جملے نے اسے شدید بے بسی کا احساس دلایا تھا اور وہ اس جاگتے ہوئے احساس کو شراب کی تلخیوں میں غرق کر دینا چاہتا تھا۔

بڑی دیر تک وہ تنہا اپنی میز پر بیٹھا پیتا رہا۔ پھر پرنس اکبر کے قہقہے کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو پرنس اکبر ایک نئی لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، قہقہے لگاتا ایک خالی میز کی طرف جا رہا تھا۔ شہباز نے پلٹ کر ناہید کو دیکھا اور پھر خوشی سے جھوم اٹھا۔ ناہید کے چہرے پر شکست خوردہ زردی پھیلی دیکھ کر اسے بے حد مسرت ہوئی تھی..........

"ویٹر.........." پرنس اکبر نے شہباز سے ملی ہوئی دوسری میز پر بیٹھ کر بلند آواز میں ویٹر کو آواز دی۔ پھر نئی لڑکی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگا۔

حالات نے ایک مثلث کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے تینوں زاویے اپنی اپنی جگہ مکمل نظر آ رہے تھے لیکن ان کی کیفیت ایک دوسرے سے جداگانہ تھی۔

ایک زاویہ پرنس اکبر کی صورت میں نئی خوشیوں کو پا کر قہقہے بکھیر رہا تھا۔

دوسرا زاویہ شہباز کا تھا جو پرنس اکبر اور ناہید کے درمیان ایک خلیج بنا سوچ رہا تھا کہ اب وہ ناہید کے غرور کو توڑ ڈالے گا..........

اور تیسرا زاویہ ناہید تھی..........

ناہید..........

جس نے زندگی کی خوشیوں کو خریدنے کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا..........

اپنے حسن اور اپنی جوانی کو قربان کیا تھا..........

مستقبل کی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی غرض سے وہ حال سے بے نیاز ہو گئی تھی..........

اس نے ایک سہارا چھوڑ کر دوسرے سہارے کو اپنانے کی کوشش کی تھی..........

اس نے عارف کو ٹھکرا کر ان کی بے بسی کا مذاق اڑایا تھا..........

کچھ دنوں تک پرنس اکبر کی کشادہ آغوش میں اپنی مسرتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی لیکن آج..........

آج پرنس اکبر کو ایک نئی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اس کے خواب بکھر گئے تھے۔

اس کا سکون برباد ہو گیا تھا..........

مستقبل کی ساری خوشیاں لرزتے اندھیروں میں سمٹ کر رہ گئی تھیں..........

گلاس کو ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ کیا وہ شکست کے احساس کو چپ چاپ برداشت کر لے یا پھر اپنی زندگی کے ہنگاموں میں ایک نئے باب کا اضافہ کر لے۔ اس کے سینے میں تلاطم برپا تھا۔ پرنس اکبر کی بے وفائی نے اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت کو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اب تک وہ ہر ہر قدم پر خود کو فریب دیتی رہی ہے۔ جان بوجھ کر دھوکہ کھاتی رہی ہے۔ اس نے بڑی اونچی چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ عارف علی کے مستحکم سہارے کو چھوڑ کر اس نے پرنس اکبر کو ایک مستقل سہارا بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن آج اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب تک ریت کے ٹیلے پر کھڑی تھی جو بادِ مخالف کے ایک ہی جھونکے سے اندر دھنستا جا رہا تھا..........

بڑی دیر تک وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور قدم بڑھاتی پرنس اکبر کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کون .... ناہید۔" پرنس اکبر نے اسے دیکھ کر سرد لہجے میں کہا۔ "تم کب آئیں یہاں؟"

"بہت دیر سے یہیں موجود ہوں.........."

"بیٹھو.........."

ناہید بیٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر اپنی جنس کے اس نئے پہلو کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی جو اس کی زندگی کی خوشیوں کی راہ میں کانٹا بن کر آ گیا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو پھر سے دہرا رہی تھی۔

ایک روز ناہید' شبانہ بیگم کے آشیانہ پر بجلی بن کر ٹوٹی تھی اور آج..........

آج ایک دوسری عورت نے ناہید کے خرمن دل کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا..........

"کیا بات ہے' تم کچھ اداس اداس سی نظر آ رہی ہو؟" پرنس اکبر کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اُبھری تو ناہید کی نظروں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے پرنس!" وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

"اس وقت مشکل ہے' میں ذرا مصروف ہوں۔" پرنس اکبر نے نئی لڑکی کو دیکھ کر ٹالنے والے لہجے میں جواب دیا تو ناہید اس چوٹ پر تلملا اٹھی۔

"کیا تم میرے لئے دو منٹ بھی نہیں دے سکتے..........؟"

"آج نہیں .... پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" پرنس اکبر نے بے رخی سے جواب دیا۔ پھر میز پر رکھی بوتل کا کاک اڑا کر گلاس بھرنے لگا۔

ناہید اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ شکست کے احساس کے ساتھ ساتھ نفرت کا جذبہ بھی ابھرتا رہا۔ وہ ٹکٹکی باندھے پرنس اکبر کو دیکھتی رہی' جس نے اسے سہارا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مستقبل کی خوشیوں کا یقین دلایا تھا۔ اسے اپنانے کی قسمیں کھائی تھیں' لیکن اچانک بدل گیا تھا..........

"پرنس.........." ناہید نے دوبارہ اسے ٹھوس آواز میں مخاطب کیا۔ "تمہیں اس وقت تنہائی میں مجھ سے کچھ باتیں کرنی ہوں گی۔"

"وقت مت برباد کرو' میں کہہ چکا ہوں کہ اس وقت میں مصروف ہوں۔"

"مجھ سے گفتگو کر لینے کے بعد تم دوبارہ بھی مصروف ہو سکتے ہو۔"

"ڈونٹ بی سلی۔" (بے وقوف مت بنو) پرنس جھلا گیا۔ "میں اس وقت تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔"

ناہید نے اسے غور سے دیکھا' پھر اس کی آنکھوں میں خون کی سرخیاں چھلک کر ابھر آئیں۔ ہونٹ چبا کر بولی۔

"میں اسی وقت تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ناہید..........!"

"پرنس!" ناہید چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تڑپ کر بولی۔ "میں تم سے اس وقت صرف یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کب کر رہے ہو؟"

"شادی.........." پرنس نے چونک کر ناہید کو دیکھا۔ پھر حقارت سے قہقہہ لگا کر بولا۔

"میں نے تم سے شادی کا وعدہ کب کیا تھا..........؟"

"پھر تم نے مجھے عارف علی سے طلاق لینے پر کیوں اُکسایا تھا؟" ناہید نے پوچھا۔ اس کی آواز میں نہ جانے کتنے طوفان اُبل رہے تھے۔

"تم اتنی بچی نہیں تھیں کہ میرے بہکانے میں آ جاتیں۔"

"لیکن تم نے مجھے سہارا دینے کا وعدہ کیا تھا.........."

"پرانی بات ہے۔" پرنس اکبر مسکرا کر بولا۔

"گویا تم نے مجھے فریب دیا تھا۔" ناہید کی آواز لرز اٹھی۔

"فریب کی بات مت کرو ناہید' ورنہ میں تم کو بھی موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم شبانہ بیگم کو کیوں بھول رہی ہو۔ اپنی خوشیوں کی خاطر تم نے بھی تو کسی کی آہوں پر اپنے ارمانوں کے محل تعمیر کئے تھے.........."

"پرنس!" ناہید کرخت آواز میں بولی۔ "تم میری زندگی کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟"

"تم انسان نہیں بلکہ انسان کے روپ میں درندہ ہو۔ خون آشام بھیڑیئے۔" ناہید غصے میں کانپ اٹھی۔

"ہوش کی دوا کرو ناہید! تم اس وقت پرنس اکبر سے بات کر رہی ہو۔" پرنس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"گویا تم نے صرف میری زندگی سے کھیلنے کے لئے میرا سکون برباد کیا تھا۔"

"وہ سکون تم کو اور بھی بہت سارے لوگ دے سکتے ہیں۔"

"پرنس!" ناہید چیخ اٹھی۔ پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے پرس کھول کر اپنا پستول نکال لیا۔ "میری زندگی برباد کر کے تم بھی مسکرانے کا کوئی حق نہیں رکھتے.........."

پھر اس کے مضبوط ہاتھوں میں دبے پستول سے شعلے نکلے اور پرنس اکبر کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ کلب کے ہنگاموں کو اچانک جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ صرف ناہید کے قہقہے گونج رہے تھے۔ فلک شگاف قہقہے' جس میں ایک عورت کی بیچارگی کا احساس بھی شامل تھا.......... اور..........

قدرت اپنے انتقام پر مسکرا رہی تھی۔

☆=======☆=======☆

جب سے نسیمہ بیگم کو عاصمہ کی حالت کا علم ہوا تھا ان کی نوازشات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمہ وقت وہ عاصمہ کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں' گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی اونچ نیچ سمجھاتی رہتیں۔ اکثر عاصمہ کبھی اٹھ کر پانی پینے کا ارادہ بھی کرتی تو وہ اُسے ٹوک دیتیں۔

"نہ بیٹی! تم لیٹی رہو' میں پانی پلائے دیتی ہوں۔ ایسی حالت میں تمہارا زیادہ کام کاج کرنا مناسب نہیں ہے۔"

"لیکن میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ خواہ مخواہ کی اس ہمدردی پر جھلا جاتی۔

"تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی بیٹی!" نسیمہ بیگم مسکرا کر کہتیں۔ "پہلوٹھی کا بچہ ہے اگر خدا نخواستہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ہمیشہ کے لئے مصیبت بن جائے گی۔"

عاصمہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ کیسے کہہ دیتی کہ اسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک مرد کی نشانی بن کر اس کے جسم میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ اس زبردستی کے سودے کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھی ایک مجبوری تھی جسے وہ بس نبھائے جا رہی تھی۔

نسیمہ بیگم جتنی دیر کے لئے عاصمہ کے پاس سے علیحدہ رہتیں ملازمہ اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی اور عاصمہ ان بندشوں اور ان ہمدردیوں سے اُکتا کر رہ گئی تھی۔

ثاقب بھی ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ جتنی دیر گھر پر رہتے ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے دور نہ رہتے۔ اس کے پاس بیٹھے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہتے' لیکن عاصمہ ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیتی۔ چپ چاپ پڑی اپنی قسمت پر کف افسوس ملا کرتی۔

"عاصمہ! جب اس گھر میں ایک نئے مہمان کا اضافہ ہو گا تو میں بڑی دھوم سے اپنی خوشیاں مناؤں گا۔" ثاقب مسکرا کر کہتے۔

عاصمہ چپ پڑی رہتی۔

"امی جان تو تمہارے لئے ہر وقت دعائیں مانگا کرتی ہیں۔ انہیں بڑا ارمان ہے کہ لڑکا ہو۔"

عاصمہ سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیتی۔

"میں نے اس کا نام بھی سوچ رکھا ہے .... عاصم .... کیسا رہے گا؟"

وہ نفرت سے کروٹ بدل لیتی۔

"پسند آیا تمہیں نام؟" ثاقب مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ جاتے۔

"خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔" وہ تڑپ کر کہتی۔

"تم مجھ سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہنے لگی ہو۔" ثاقب نرمی سے پوچھتے۔

"جواب میں وہ ثاقب کو حقارت بھری نظروں سے گھورتی پھر ہونٹ چبا کر آنکھیں موند لیا کرتی۔

"عاصمہ! اگر مجھ سے نادانستگی میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو میں معافی مانگتا ہوں' لیکن خدا کے لئے تم اُداس نہ رہا کرو۔"

وہ آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑی رہتی۔

"میں نے آج لیڈی ڈاکٹر سے کہہ دیا ہے' کل سے وہ تم کو دونوں وقت دیکھنے آیا کرے گی۔"

عاصمہ اس اطلاع پر چونک پڑی۔ پھر اگلے دن ایک خوبصورت سی لیڈی ڈاکٹر اسے دیکھنے آئی تو عاصمہ کی نگاہوں میں امید کی کرن جگمگا اٹھی۔ جتنی دیر لیڈی ڈاکٹر اسے دیکھتی رہی وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اس کا منہ تکتی رہی۔ سوچتی رہی کہ اس سے اپنا دکھ کہے یا نہ کہے۔ پھر جب وہ دوائیں تجویز کر کے جانے کے لئے اٹھی تو عاصمہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ڈاکٹر! کیا آپ میرے مرض کو سمجھ چکی ہیں؟"

"مرض کا ہے کا بی بی! آپ کے ہاں تو خوشی ہونے والی ہے۔"

"خوشی.........." عاصمہ کے دل پر ایک ٹ سی لگی۔ اس نے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو۔

تعجب ہے کہ تم عورت ہو کر بھی عورت کا درد نہیں پا سکیں۔ خوشی کا تعلق تو دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے اور میرا دل تو کب کا ٹوٹ چکا ہے۔

کیا ٹوٹے ہوئے دل بھی خوشیوں کے جذبوں کو پا سکتے ہیں اور پھر یہ کیسی خوشی ہے جس کا اس کی اپنی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے............

جس میں اس کا اپنا کوئی حصہ نہیں ہے............

گھٹن کے احساس نے شدت اختیار کی تو پلکوں کے پیچھے چھپے ہوئے آنسو اُس کی غزالی آنکھوں میں آ کر مچل اٹھے۔

"دل چھوٹا نہ کرو بی بی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" لیڈی ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو تسلی دینے لگی۔

"کیا ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر!" وہ کپکپائی آواز میں بولی۔

"وہی جس کے لئے تم پریشان ہو رہی ہو۔" ڈاکٹر مسکرا کر بولی۔

"ڈاکٹر!" عاصمہ کی آواز رندھ گئی۔

"حوصلہ رکھو بی بی' میں دونوں وقت تمہیں دیکھنے آؤں گی۔" ڈاکٹر نے پیار سے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر............ مجھے بچے کی تمنا نہیں ہے۔"

"بچے کی تمنا نہیں ہے............؟" لیڈی ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ پھر دواؤں کا بیگ میز پر رکھ کر دوبارہ عاصمہ کے قریب بیٹھ گئی۔

"ہاں ڈاکٹر میں ماں نہیں بننا چاہتی۔" اس کی آنکھوں سے حسرت ٹپک رہی تھی............

"کیوں............؟"

"میرے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔" عاصمہ تڑپ کر بولی۔ "اگر تم مسیحا بن کر آئی ہو ڈاکٹر' تو میرے جسم کے اس ناسور کو میرے وجود سے نکال پھینکو جس نے میری راتوں کی نیند اور دن کا چین سب کچھ چھین لیا ہے۔"

"میری دواؤں سے آپ کو آرام آ جائے گا بی بی!" ڈاکٹر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "شروع شروع کی بات ہے۔ اس لئے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ دو چار دنوں میں مکمل آرام آ جائے گا۔"

"اف ڈاکٹر! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں ماں بننے کی خواہشمند نہیں ہوں۔" عاصمہ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"کیا ثاقب صاحب بھی بچے کے خلاف ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"مجھے دوسروں سے کوئی سروکار نہیں ہے ڈاکٹر! خدا کے لئے میرے اوپر رحم کھاؤ' اور مجھے اس درد سے نجات دلا دو' جس نے میری روح تک کو زخمی کر ڈالا ہے۔"

"آل رائٹ' میں آپ کے شوہر سے پوچھوں گی۔"

"تکلیف مجھے ہے ڈاکٹر اور تم دوسروں سے مشورہ کرو گی۔" عاصمہ بڑے حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ "کیا مجھے اب میرے جسم پر بھی کوئی اختیار نہیں رہا۔ کیا میری خواہشات بھی اب دوسروں کی مرضی کی پابند ہیں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے عاصمہ کے چہرے پر بکھرے بکھرے تاثرات کو جیسے پڑھ لیا تھا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔

"کیا آپ اپنے شوہر سے خوش نہیں ہیں؟"

"مجھے دوسروں کی نہیں صرف اپنی خوشی کا خیال ہے ڈاکٹر!" عاصمہ بولی۔ "دوسروں نے بھلا کب میری خوشیوں کا خیال کیا ہے۔ کب انہوں نے میرے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے جذبات تو ایسی بے دردی سے کچلے گئے ہیں کہ اب زندگی کی تمنا بھی باقی نہیں رہی............"

"میرا خیال ہے کہ آپ کے ذہن کو کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔" ڈاکٹر نے ہمدردی کا اظہار کیا تو عاصمہ نے نفرت سے کہا۔

"مجھے تمہاری ہمدردی کی نہیں بلکہ تمہاری مسیحائی کی ضرورت ہے ڈاکٹر!"

"میں کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی کام آ سکوں۔"

"کوشش نہیں' وعدہ کرو ڈاکٹر کہ تم مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دو گی۔"

"ہمت ہار دینا بزدلی ہے بی بی!" ڈاکٹر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں دو چار روز میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گی۔"

عاصمہ نے شکایت بھری نظروں سے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا' پھر نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے اپنا چرمی بیگ لئے چلی گئی' تو عاصمہ کے امڈتے ہوئے جذبات میں جیسے طغیانی آ گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب تمام بندشیں توڑ کر بہہ نکلا تھا۔ بڑی دیر تک وہ اپنی مجبوری پر آنسو بہاتی رہی۔ پھر ثاقب کے قدموں کی مانوس سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اُس نے جلدی سے اپنے آنسو خشک کر لئے۔ مرد کے سامنے وہ اپنی

بے بسی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ثاقب اس کے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ چہرے پر اداسیاں رقص کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں الجھن تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک طویل مسافت طے کر کے آ رہے ہوں۔ تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھے عاصمہ کو تکے جا رہے تھے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

کئی لمحے یوں ہی خاموشی سے گزر گئے............

عاصمہ نے کنکھیوں سے ایک بار ثاقب کے چہرے پر نظر ڈالی تو جانے کیوں اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سوچنے لگی کہیں لیڈی ڈاکٹر نے اس کی باتوں کا تذکرہ ثاقب سے تو نہیں کر دیا۔ یقیناً یہی بات ہو گی، جب ہی تو ثاقب کھوئے کھوئے سے نظر آ رہے تھے۔ کتنی حسرت ناک تاریکی تھی ان کے اداس اداس چہرے پر، اور یہ سب عاصمہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ جس نے مرد کے پیار کی نشانی کو جنم دینے سے انکار کیا تھا۔ جو خود آگ بن کر دوسروں کو بھی جھلسا دینے کی آرزومند تھی۔

عاصمہ اپنی سوچوں میں گم لیٹی چھت کو تکتی رہی، دل کے ویران گوشے سے ایک دبی دبی آواز ابھری۔

عاصمہ .... آخر ثاقب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے .... تم ایک مرد کی بے وفائی کا بدلہ دنیا کے تمام مردوں سے کیوں لے رہی ہو، اور پھر اس بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جس کی تم نے ابھی تک شکل بھی نہیں دیکھی .... تم تو اس کی ہونے والی ماں ہو .... کیا ماں کی ممتا اولاد کی معصومیت کا خون برداشت کر لے گی؟

الفاظ صدائے بازگشت بن کر اس کی روح کی گہرائیوں میں گونجنے لگے۔ وہ دل کی اس آواز پر جھنجھلا گئی۔ پلٹ کر ثاقب کی طرف دیکھا تو ان کی پلکوں پر آنسوؤں کے دو شبنمی قطرے نہ جانے کب سے لرز رہے تھے۔ ہمدردی کا احساس ایک لمحے کے لئے جاگا، لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے ماضی کی تلخ یادوں کا سہارا لے کر اس احساس کو نفرت اور حقارت کے جذبے تلے روند ڈالا۔ یوں ثاقب کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں جیسے اندھیری اور تاریک راتوں میں اچانک دو مسافر آمنے سامنے آ گئے ہوں اور پھر ان کی راہیں جدا جدا ہو گئی ہوں..........

"عاصمہ!" کمرے کے سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی ثاقب کی آواز ابھری تو عاصمہ نے

اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ اس لئے کہ کہیں وہ حالات کے دھارے میں بہہ کر ہمدردی کا جواب ملائمت سے نہ دے بیٹھے۔

"عاصمہ!" ثاقب نے دوبارہ آواز دی۔

"فرمائیے۔" اس نے ٹھہری ہوئی سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"تم میری خوشیوں کو پامال کرنے کی خواہشمند کیوں ہو؟"

وہ مہر بہ لب رہی............

"کیا تم کو میرے احساسات کا کوئی خیال نہیں ہے؟"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا............

"میری محبت کا جواب اتنی نفرت سے تو نہ دو کہ میرا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے............"

عاصمہ اب بھی خاموش تھی............

"تم میری اولاد کی ماں نہیں بننا چاہتیں نا............" ثاقب نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں .... میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی۔" اُس نے تیزی سے کہا اور پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے جواب سے ثاقب کی پلکوں پر تھمے ہوئے آنسوؤں کے وہ قطرے ڈھلک کر اس کے دامن میں جذب ہو گئے تھے جنہیں اس نے بڑی کوششوں سے روک رکھا تھا۔

"عاصمہ! تمہیں میری آرزوؤں کو پامال کر کے آخر کیا مل جائے گا؟" ثاقب نے لرزتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

عاصمہ ایک بار پھر برف کا تودہ بن گئی............

"تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے آخر؟"

وہ ہونٹوں کو بھینچے چھت کو تکتی رہی............

"اچھا.........." ثاقب نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "اگر تمہاری خوشی یہی ہے تو میں بھی لیڈی ڈاکٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہاری خوشیوں کی تکمیل کر دے۔"

"شکریہ!" عاصمہ کا رواں رواں جھوم اٹھا۔

"میں تمہاری ہر خوشی کا سہارا بن جاؤں گا عاصمہ!"

"مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔" عاصمہ تڑپ اٹھی۔

ثاقب کے جملے نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ مرد کا سہارا حاصل کرنے کی متمنی تو کبھی نہ تھی' پھر ثاقب نے ایسا کیوں کہا تھا۔ اس نے تو محض ثاقب کی خوشیوں کو روند ڈالنے کی خاطر اس کی نشانی کو ختم کر دینے کی خواہش کی تھی۔ وہ ایک مرد سے انتقام لینے کے لئے کس قدر مضطرب تھی۔

لیکن..........

وہی مرد اس کے لئے سہارے کی پیشکش کر رہا تھا..........

اس کی آرزوؤں میں برابر کا حصہ دار بن رہا تھا..........

عاصمہ کا ذہن جھنجلا اٹھا۔ نسوانیت کی شکست کے احساس نے اسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ نفرت کے تشنہ جذبات ابھرے تو اُس کا چہرہ تپ کر گلنار ہو گیا..........

"تم مجھ سے اور کیا چاہتی ہو؟" ثاقب نے نرم آواز میں پوچھا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" وہ شکست خوردہ احساسات سے پامال ہو کر بولی۔

"میری طرف دیکھو عاصمہ! میں تمہاری خاطر مسکراتے ہوئے موت کو بھی گلے لگانے کو آمادہ ہو سکتا ہوں۔"

"مجھے کسی کے مرنے یا جینے سے کیا واسطہ؟"

"پھر یہ خفگی کس لئے ہے؟"

"ثاقب!" وہ چیخ اٹھی۔ "خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں اپنی زندگی کے اس شیرازے کو خود اپنے ہاتھوں سے منتشر کر ڈالوں گی جسے اب تک میں نے دل پر جبر کر کے سمیٹے رکھا ہے۔"

ثاقب بڑی آہستگی سے اٹھے' ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے عاصمہ کو دیکھا جس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ پھر کسی لٹے ہوئے مسافر کی طرح تھکے تھکے انداز میں قدم اٹھاتے باہر آ گئے..........

☆======☆======☆

شبانہ بیگم کی نظر اخبار کی سنسنی خیز سرخی پر پڑی تو اُن کا دل کانپ اٹھا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ ماضی کے بکھرے ہوئے نقوش سمٹ کر کسی تصویر کی طرح نظروں کے سامنے گھوم گئے۔

دھڑکتے ہوئے دل سے انہوں نے جلدی جلدی اس خبر کو پڑھا جس میں ناہید کے پرنس اکبر کو گولی مار دینے کی تفصیل درج تھی۔ اخبار کے نمائندے نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ زندگی کی تلخیوں سے اُکتا کر ناہید نے جو اقدام قتل کا ارتکاب کیا ہے اس سے اس کے ذہن پر گہرا اثر پڑا ہے' اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ پولیس نے اس کا بیان لینے کی کوشش کی تھی لیکن ناہید نے ہر سوال کے جواب میں بس ایک ہی جواب دیا۔

"میں نے اپنی خوشیوں کو مار ڈالا ہے۔"

شبانہ بیگم جوں جوں خبر پڑھتی گئیں اُن کی نبض کی رفتار تیز ہو گئی اور پھر اچانک ان کے ذہن کو ایک ایسا جھٹکا لگا کہ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے خلا میں گھورنے لگیں جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"ناہید شہر کے مشہور تاجر اور سرمایہ دار عارف علی کی بیوی بھی رہ چکی ہے۔"

یہ جملہ ان کے ذہن کی گہرائیوں میں چبھ کر رہ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگیں۔ آخر ناہید کو طلاق کب ہوئی تھی۔ کیونکر ہوئی تھی' آصف نے تو انہیں یہ خبر نہیں سنائی تھی کہ شیخ عارف علی ناہید کو طلاق دے چکے ہیں..........

وہ بڑی دیر تک گم صم بیٹھی اپنی سوچوں میں محو رہیں۔ ماضی کے گھاؤ میں حال نے جو تازہ نشتر چبھویا تھا اس نے آج انہیں پھر بے چین کر دیا تھا۔ ناہید نے پرنس اکبر کو کیوں اور کن حالات میں گولی ماری تھی۔ اس بات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف شوہر کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

شوہر..........

جس کی خوشی کی خاطر انہوں نے اپنی وفاؤں کی قربانی دی تھی..........

اپنے ارمانوں اور اپنی تمناؤں کا خون کیا تھا..........

دل پر جبر کر کے اس دہلیز کو چپ چپاتے خیرباد کہہ دیا تھا جس کی اڑتی ہوئی دھول بھی ان کی وفاشعاری کا ثبوت دینے کی خاطر بے چین تھی۔

شوہر کی خوشیوں ہی کی خاطر تو وہ آج تک اپنے سہاگ کو سینے سے لگائے الگ تھلگ بیٹھی تھیں۔ انہیں شوہر کی عزت کا خیال تھا۔

وہ عزت جسے انہوں نے بارہ سال تک اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا..........

اسی عزت کی خاطر تو وہ آج تک گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں............

لیکن آج جب انہیں شوہر کی عزت پر حرف آتے محسوس ہوا تو وہ تڑپ کر رہ گئیں............

بہت سے لمحات یوں ہی پریشان پریشان خیالات میں گزر گئے۔ پھر وہ دل پر جبر کر کے اٹھیں' برقعہ پہنا اور عاصمہ کی طرف آ گئیں۔

نسیمہ بیگم بہو کے پاس بیٹھیں اس کی دلجوئی میں مصروف تھیں۔ شبانہ بیگم کو دیکھا تو جلدی سے مسکرا کر اٹھیں اور بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

"زہے قسمت کہ آج بہن بن بلائے آ گئیں۔"

"طبیعت ہی ٹھیک نہیں تھی ورنہ یہ بھی میرا اپنا ہی گھر ہے۔"

شبانہ بیگم کا دل رو رہا تھا لیکن وہ حالات سے مجبور ہو کر مسکرا رہی تھیں۔

"اسے اپنا گھر سمجھتی تو میرا کہا کبھی نہ ٹالتیں۔" نسیمہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ آصف کو لے کر یہیں چلی آؤ۔"

"آپ کی نوازشوں کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں بہن' لیکن بیٹی کے سسرال میں رہنا کچھ اچھا نہیں لگتا اور پھر دنیا والے............"

"دنیا کی بھلی کہی تم نے۔" نسیمہ بیگم جلدی سے بولیں۔ "انہیں باتیں بنانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے بہن لیکن............"

"مجھے پتہ ہے کہ تم میری بات کو کبھی نہ مانو گی۔" نسیمہ بیگم مسکرائیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بہن! آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔" شبانہ بیگم کا دل بھر آیا۔ دُکھے ہوئے دل کو کسی کی ہمدردی کا احساس ہوا تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا اٹھے۔

"میری بیٹی بھی تمہیں کئی دنوں سے یاد کر رہی تھی۔" نسیمہ بیگم نے شبانہ بیگم کی کیفیت کو محسوس کیا تو جلدی سے موضوع بدل کر بولیں۔

"اسی لئے تو چلی آئی دیکھنے۔"

"ہاں بہن! دنیا کا یہی دستور ہے۔" نسیمہ بیگم نے عاصمہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنی بیٹی ہوتی تو تم کم از کم روز ایک چکر لگاتیں۔ میری بیٹی کا بھلا تم کو

کیسے خیال آ سکتا ہے؟"

جواب میں شبانہ بیگم بھی ہنس دیں۔

"خدا کے فضل سے اب دو ایک مہینے میں میری بیٹی کے ہاں خوشی ہونے والی ہے اس لئے کچھ دنوں کے لئے یہیں چلی آؤ تو بہتر ہے۔"

"اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو آ جاؤں گی کچھ دنوں کے لئے۔"

"کچھ دنوں کے لئے کیوں' اب آئی ہو تو یہیں ٹھہر جاؤ نا۔ تمہارے اور آصف میاں کے لئے بھی دو کمرے ٹھیک کرا دیتی ہوں۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے بہن!"

"ہاں' تم بھلا میری بات کیوں سنو گی۔ اگر تمہارے بیٹے نے کہا ہوتا تو کبھی انکار نہ کرتیں۔" نسیمہ بیگم نے اپنائیت کا اظہار کیا۔ "آنے دو ثاقب کو میں اسی کو تمہارے پاس بھیج دوں گی۔"

"خدا ثاقب میاں کو سلامت رکھے' بڑا نیک اور سعید لڑکا ہے۔"

"کبھی میری عاصمہ کے لئے دو جملے تعریف کے بول دیا کرو۔ ایسی بھی کیا غیریت کہ جب دیکھو اپنے ثاقب کی تعریفیں کرتی رہتی ہو۔"

شبانہ بیگم کی پلکوں پر خوشی کے آنسو تھرتھرا اٹھے۔ کچھ دیر تک نسیمہ بیگم بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر وہ اٹھ کر کام کے بہانے سے چلی گئیں تو شبانہ بیگم نے بیٹی کو مخاطب کیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"ٹھیک ہوں امی جان!" عاصمہ نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"لیڈی ڈاکٹر تو دونوں وقت دیکھنے آتی ہے نا!؟"

"جی ہاں۔"

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا بات ہے عاصمہ بیٹی! تم کچھ دنوں سے اداس اداس نظر آ رہی ہو۔" شبانہ بیگم کی ممتا نے جیسے بیٹی کے دل کے چور کو پکڑ لیا تھا۔

"طبیعت بوجھل بوجھل سی رہتی ہے' ورنہ اداسی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

عاصمہ نے ماں کی خوشنودی کی خاطر جھوٹ بولا' پھر ماں کے چہرے کو تکنے لگی۔ اسے یہ دیکھ کر دُکھ ہوا تھا کہ شبانہ بیگم پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گئی تھیں۔

"آصف بتا رہا تھا کہ ثاقب بھی تمہارا بے حد خیال رکھتے ہیں۔"

"آپ نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" عاصمہ نے ماں کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا دواؤں کا استعمال بند کر دیا ہے؟"

"کبھی کبھی پی لیتی ہوں۔" شبانہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا' پھر اصل مقصد کی طرف آئیں۔ "تم نے آج کا اخبار دیکھا۔"

"نہیں .... کیوں؟"

"بڑی بُری خبر چھپی ہے بیٹی.........."

عاصمہ کچھ پوچھنے کے بجائے ماں کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ناہید نے کسی شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے.........."

عاصمہ کا دل اچانک دھڑک اٹھا۔ معاً اس کے دل میں یہ خیال بڑی سرعت کے ساتھ ابھرا تھا کہ کہیں وہ شخص شیخ عارف علی تو نہیں ہے۔ ہرچند کہ اسے باپ سے شدید نفرت تھی لیکن اس وقت نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جس نے اس کے نفرت کے جذبے کو روند کر ہمدردی کے جذبے کو ابھار دیا' تصویرِ حسرت بنی ماں کی صورت تکتی رہی۔

"کوئی پرنس اکبر نامی شخص تھا جسے ہلاک کیا گیا ہے۔"

عاصمہ نے اطمینان کا سانس لیا..........

"اخبار کی اطلاع کے مطابق ناہید اپنا دماغی توازن کھو بیٹی ہے۔"

"دوسروں کے گھر کو اجاڑنے کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔" عاصمہ نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔ "قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے.........."

"مجھے ناہید سے کوئی شکایت نہیں ہے بیٹی! جب اپنا نصیب بُرا ہو تو دوسروں سے شکایت کرنا فضول ہے۔"

"دوسروں کو بھی تو ہماری خوشیوں کا پاس لازم تھا۔"

"مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" شبانہ بیگم نے دبی زبان میں کہا۔ "مجھے تو ایک نئی اطلاع نے پریشان کر دیا ہے۔"

"کیا..........؟"

"اخبار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ناہید کو تمہارے باپ طلاق دے چکے ہیں۔"

"مجھے اس کا علم بہت پہلے ہو چکا تھا۔" عاصمہ نے حقارت سے جواب دیا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا بیٹی!"

"فائدہ .... ہو سکتا ہے کہ ابا جان کا دل ناہید سے بھی بھر چکا ہو اور اب وہ کسی اور کو اپنی زندگی کی زینت بنانے کے خواب دیکھ رہے ہوں۔"

"عاصمہ! ایسا مت سوچو بیٹی!" شبانہ بیگم نے سرد آہ بھری۔ "وہ تمہارے باپ ہیں اور پھر انسان دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی اپنی غلطیوں کا احساس کرتا ہے۔"

عاصمہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا' پھر ماں کا خیال کر کے چپ ہو رہی۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہارے باپ نے اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ناہید کو طلاق دی ہو۔"

"مجھے اس پر شبہ ہے امی جان۔" عاصمہ بولی۔ "اول تو مرد سے وفا کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ پھر اگر آپ کی بات ٹھیک بھی ہو تو کیا ابا جان نے ناہید کے ساتھ ظلم نہیں کیا.........."

"اگر مجھے اس بات کا علم نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ میں بھی وہی سوچتی جو تم سوچ رہی ہو۔"

"میں سمجھی نہیں۔" عاصمہ نے چونک کر ماں کے چہرے کو دیکھا۔

"تمہارے باپ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کے خواہشمند ہیں۔"

"آپ کو کیسے علم ہوا؟"

"واقعات ہمیشہ ڈھکے چھپے نہیں رہتے بیٹی!"

"آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

"میں اسی غرض سے تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم سے بھی مشورہ کر لوں۔" شبانہ بیگم کی آنکھیں نمناک ہو گئیں' بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "میرا کیا ہے بیٹی' زندگی کے دن جیسے تیسے گزر ہی جائیں گے لیکن میری تمنا ہے کہ تم اور آصف ہمیشہ خوش رہو۔"

"امی جان! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آپ کی زندگی ابھی ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔"

"موت اور زندگی پر ہمارا کیا اختیار ہے بیٹی!"

"پھر بھی مایوسی کی باتیں نہ کیا کیجئے۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"صدمہ تو اس بات کا ہے بیٹی کہ میری قربانیاں رائیگاں چلی گئیں۔" شبانہ بیگم کی آواز میں درد تھا۔ "میں نے تو تمہارے باپ کو ہمیشہ خوش رکھنا چاہا تھا۔ انہی کی خوشیوں کی خاطر تو میں ان کی راہ سے الگ ہوئی تھی لیکن.........."

"ان باتوں کو بھول جائیے امی جان!" عاصمہ جلدی سے بولی۔ "گزرے ہوئے لمحات اور گزرا ہوا وقت کبھی پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا۔"

"لیکن عزت اگر ایک بار سرِ بازار نیلام ہو جائے تو پھر دوبارہ کبھی حاصل نہیں ہوتی۔" شبانہ بیگم دبی آواز میں بولیں۔ "ناہید کے سلسلہ میں تمہارے باپ کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قانون انہیں بھی پریشان کرنے کی کوشش کرے۔"

"قانون بھی مرد کی طرح اندھا ہوتا ہے.......... چوٹ برابر کی رہے گی۔"

"بُری بات ہے عاصمہ! باپ کے لئے ایسے کلمات زبان پر لانا گناہ ہے۔"

"گناہ..........!" عاصمہ تڑپ کر بولی۔ "گناہ کا احساس صرف عورت ہی کے لئے مخصوص ہو کر کیوں رہ گیا ہے؟ عورت کی ایک معمولی لغزش بھی اسے بدنامیوں کی عمیق گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیتی ہے، لیکن مرد چاہے کچھ کرتا پھرے اُس پر انگلی نہیں اٹھتی.......... آخر کیوں؟.......... اور پھر کیا یہ گناہ نہیں ہے کہ کسی کو بلاوجہ دھکے دے کر گھر سے بے گھر کر دیا جائے؟ کیا یہ گناہ نہیں ہے کہ انسان اپنی خوشی کی خاطر کسی دوسرے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین لے؟ خود ہنسنے کے لئے دوسروں کو رونے پر مجبور کر دے۔ کیا یہ عظیم گناہ نہیں ہے۔ کیا یہ گناہ نہیں ہے کہ ایک معصوم اولاد کو خود اس کا باپ اپنی شفقت پدری سے محروم کر دے اور حوادث زمانہ کے سپرد کر دے.......... نہیں امی جان!.......... گستاخی معاف' میں ایسے باپ کو باپ کہنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتی۔"

"عاصمہ! خدا کے لئے ایسا مت کہو۔ عاصمہ! میں تم کو اپنی ماتا کا واسطہ دیتی ہوں کہ اس انداز میں مت سوچو۔" شبانہ بیگم نے کچھ ایسے ٹوٹے ہوئے لہجہ میں کہا کہ عاصمہ تڑپ اٹھی۔

"امی جان!" وہ مچل کر ماں کی کشادہ آغوش میں سما گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آنسوؤں کا سیلاب تھما تو دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ شبانہ بیگم نے بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کسی کو معاف کر دینا سب سے بڑا ثواب ہے بیٹی! قدرت کو اگر منظور ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے گھاؤ بھی مندمل ہو جاتے ہیں۔"

"نہیں امی جان! میں آپ کو دنیا کی کسی طاقت کے سامنے جھکتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"سہاگ کے لئے عورت کو بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، عاصمہ!" شبانہ بیگم نے کہا۔ "شوہر کو تو خداوند کریم نے بہت بڑا درجہ دیا ہے۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ لیٹی اپنے خیالات میں گم رہی۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ کسی وقت آصف کو تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گی۔"

"کیوں؟"

"شاید انہیں ہماری ضرورت ہو۔"

"نہیں.......... آپ آصف کو وہاں ہرگز نہیں بھیجیں گی۔" عاصمہ نے تیزی سے کہا۔ "جب باپ کو آج تک ہمارا خیال نہ آیا تو پھر ہم کیوں اُن کے بارے میں سوچیں؟"

"اچھا.......... اگر تم نہیں چاہتیں تو میں آصف کو نہیں بھیجوں گی لیکن اگر تمہارا باپ خود سے کبھی آ گیا تو کیا ہو گا؟"

"وہ دوبارہ ایسا نہیں کریں گے۔" عاصمہ کی پیشانی پر ناخوشگوار خطوط ابھر آئے۔ اُسے وہ دن یاد آ گیا جب عارف علی بڑی امیدوں سے چل کر اس کے پاس آئے تھے اور اس نے انہیں بے نیل و مرام واپس لوٹا دیا تھا۔ اس روز اسے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ جیسے اس نے ماں کی بربادیوں کا انتقام پورا کر دیا تھا۔

"عاصمہ!" شبانہ بیگم کا دل انجانے احساس سے دھڑک اٹھا۔ "کیا تمہارے باپ کبھی پہلے بھی ہمارے دروازے تک آئے تھے؟"

"جی.........." عاصمہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جلدی سے بولی۔ "انہیں ہمارے دروازے تک آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟"

"پھر تم نے کیوں کہا کہ وہ دوبارہ ایسا نہیں کریں گے؟"

عاصمہ نے بڑی سختی سے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ شبانہ بیگم غور سے بیٹی کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کوئی بات ان سے چھپانے کی کوشش کی جا

رہی ہے۔ عاصمہ کے چہرہ کو پڑھ کر بولیں۔

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو شاید!"

"کوئی بات نہیں ہے امی جان! آپ کو وہم ہو رہا ہے۔"

"وہم بھی کبھی کبھی حقیقت بن جاتے ہیں..........."

"میں نے یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔" عاصمہ نے جلدی سے کہا۔

شبانہ بیگم سر جھکائے کچھ سوچتی رہیں' پھر دبی زبان میں بولیں۔

"مجھے اپنی زندگی سے زیادہ تمہارا اور آصف کا خیال ہے بیٹی' تم لوگ جو چاہو گے وہی ہو گا۔"

"آصف کے امتحانات میں اب کتنے دن رہ گئے ہیں؟" عاصمہ نے موضوع بدلنا چاہا تو شبانہ بیگم کے لرزتے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم تڑپ کر نڈھال ہو گیا۔ دل پر جبر کر کے بولیں۔

"ابھی ایک ماہ باقی ہے۔"

"اس کا خیال رکھئے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو۔"

"میری دعائیں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہیں گی۔ خدا نے چاہا تو آصف ضرور اچھے نمبروں سے پاس ہو گا۔"

"آپ اپنی طرف سے بھی غافل نہ ہوں' دوائیں پیتی رہیں برابر۔"

"دوائیں روح کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتیں۔ پھر بھی تمہاری خاطر میں دواؤں کی تلخی کو برداشت کروں گی۔"

"امی جان! کیا آپ کو میری کسی بات سے دکھ ہوا ہے؟" عاصمہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"مجھے کوئی دکھ نہیں ہے بیٹی! تم اور آصف خوش رہو' اسی میں میری خوشی ہے۔"

شبانہ بیگم نے مسکرا کر کہا پھر پیار سے بیٹی کی پیشانی چوم لی۔

نسیمہ بیگم کے آنے سے گفتگو کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بہت دیر تک وہ نسیمہ بیگم سے بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ پھر شام کی چائے پی کر واپس لوٹ آئیں۔

دھڑکتے ہوئے قدم سے اپنے گھر میں واپس ہوئیں تو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی...........

☆======☆======☆

دو مہینے یوں پلک جھپکتے بیت گئے جیسے ابھی کل کی ہی بات ہو۔ آصف کا نتیجہ آیا۔ وہ اوّل درجے میں پاس ہوا تھا۔ عاصمہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اپنے غم بھول کر وہ بھائی کی خوشیوں میں شریک ہو گئی۔ شبانہ بیگم نے دعوت کا اہتمام ثاقب کے گھر پر ہی کیا تھا تاکہ عاصمہ بھی اس میں حصہ لے سکے۔

خوشیوں کا دور آیا اور پلک جھپکتے میں بیت گیا اور آج .... آج عاصمہ موت و زندگی کی کشمکش سے دوچار تھی۔

کمرے میں لیڈی ڈاکٹر اور دو نرسوں کے علاوہ نسیمہ بیگم اور شبانہ بیگم بھی موجود تھیں۔ ثاقب کمرے کے باہر امید و بیم کی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ آصف چپ چاپ ایک طرف بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

مرد کی نفرت کے احساس نے عاصمہ کی تکلیف میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ نرسیں اسے پکڑے بیٹھی تھیں لیکن وہ تڑپ تڑپ کر چیخ اٹھتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اسے پیار سے سمجھاتی۔

"ہمت سے کام لو بی بی! کچھ دیر کی بات اور ہے۔"

نسیمہ بیگم بڑی شفقت سے کہتیں۔

"میری اچھی بیٹی! گھبراؤ مت' میں تمہارے پاس ہوں۔"

اور شبانہ بیگم کی ممتا اولاد کی تڑپ کا تماشہ دیکھ کر بارگاہ الٰہی میں دعاگو تھیں...........

"خداوند تعالیٰ! آج میری ممتا کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیل کر اپنے جگر گوشے کی پرورش کی ہے۔ اس پودے کو پروان چڑھایا ہے جو بہاروں کے موسم میں بھی خزاں کا شکار ہو گیا تھا۔ میرے معبود اس پودے کو سرسبز و شاداب رکھنا۔ کہیں یہ مرجھانے نہ پائے! بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد میری قسمت نے آج یہ خوشی کی گھڑی میسر کی ہے۔ کہیں ان خوشیوں کو آنسوؤں میں نہ بدل دینا میرے مالک! اور اگر تجھے کوئی قربانی درکار ہے تو مجھے اٹھا لے' لیکن میری عاصمہ کو زندہ رہنے دے۔ اس معصوم کی گود ہری کرنے میں بخل سے کام نہ لینا میرے مولا!"

لیڈی ڈاکٹر بڑی توجہ سے عاصمہ کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تسلی دے رہی تھی۔ اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کر رہی تھی' لیکن عاصمہ زندگی کی اذیت ناک تکلیف میں

مبتلا تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان خوشیوں میں اس کا تو کوئی دخل نہیں ہے۔ پھر یہ تکلیف بھی اسی کے حصے میں کیوں ڈال دی گئی اور درد کی شدت جب حد سے گزر جاتی تو وہ کرب کی سی کیفیت میں چیخ اٹھتی۔ اپنے لئے موت کی دعائیں مانگنے لگتی' لیکن قدرت کو شبانہ بیگم کی دعائیں زیادہ پسند آ گئی تھیں۔ ماں کے دل سے نکلی ہوئی آہوں نے عرشِ الٰہی کو ہلا دیا تھا۔ ممتا کی ڈبڈبائی ہوئی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو شانِ کریمی نے موتی سمجھ کر قبول کر لیا۔

شبانہ بیگم بیٹی کی مسہری کے قریب جانماز پر سجدہ ریز تھیں۔ ممتا کی پکار جاری تھی کہ لیڈی ڈاکٹر کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"لڑکا مبارک ہو............"

اور شبانہ بیگم کی بوڑھی آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسو خوشی کے جذبے سے سرشار ہو کر ڈھلک گئے۔ انہوں نے خدا کی بخشی ہوئی اس نعمت پر شکر ادا کیا پھر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

نسیمہ بیگم بہو کے سرہانے بیٹھی بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ نرسوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نومولود بچے کو غسل دے کر کپڑوں میں ملبوس کر رہی تھی اور عاصمہ یوں آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑی تھی جیسے اسے ان خوشیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا جو اس کے گرد و پیش بکھری ہوئی تھیں۔

شبانہ بیگم جلدی سے بڑھ کر بیٹی کے پاس بیٹھ گئیں۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے آواز دی۔

"عاصمہ .... میری بیٹی!"

عاصمہ نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا۔ پھر ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو شبانہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"بیٹا مبارک ہو! خدا نے میری دعاؤں کی لاج رکھ لی بیٹی!"

جواب میں عاصمہ کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کپکپائے پھر اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

نسیمہ بیگم کو ثاقب کا خیال آیا تو جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکیں۔ خوشی خوشی دروازہ کھول کر باہر آئیں تو ثاقب مجسم سوال بن کر ان کے سامنے آ گئے۔ ان کی

نظروں میں ایک ہی سوال رقص کر رہا تھا۔

"کیا ہوا امی حضور؟"

"بیٹا مبارک ہو ثاقب!" نسیمہ بیگم نے مسرت آگیں لہجے میں کہا۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" ثاقب نے اطمینان کا سانس لیا۔

آصف نے بھانجے کی پیدائش کی خبر سنی تو کسی شگفتہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ جلدی سے اٹھ کر نسیمہ بیگم کے قریب آ گیا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو آصف میاں! خدا نے تم کو ماموں بنایا ہے۔"

"امی حضور!" ثاقب نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "عاصمہ تو ٹھیک ہے؟"

"خدا نے بڑا فضل کیا۔ ورنہ میں تو ڈر گئی تھی۔" نسیمہ بیگم بولیں۔ "تم ملازم سے مٹھائی منگواؤ جلدی سے' میں نیاز دے کر اسے محلے والوں میں تقسیم کروں گی۔"

"امی حضور .... کیا میں.........."

"ابھی نہیں .... کچھ دیر اور انتظار کرو۔" نسیمہ بیگم مسکرا کر بولیں۔ پھر جلدی سے اندر چلی گئیں............

لیڈی ڈاکٹر عاصمہ سے کہہ رہی تھی.............

"اب تو تم کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے؟"

"شکایت کیسی ڈاکٹر! میں تو آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔" شبانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

عاصمہ آنکھیں کھولے چپ چاپ پڑی تھی۔

"معاف کرنا بہن! میں تمہیں تو مبارک باد دینا بھول ہی گئی تھی۔" نسیمہ بیگم نے شبانہ بیگم سے کہا۔ "نواسہ مبارک ہو تمہیں۔"

"اللہ اسے زندگی دے۔" شبانہ بیگم نے بچے کو دیکھ کر کہا جو عاصمہ کے پاس لیٹا ہوا تھا۔

"بڑا صابر بچہ ہے۔" نسیمہ بیگم نے پوتے کی بلائیں لے کر جواب دیا۔ "کیسا خاموش خاموش ہے ورنہ بچے تو پیدا ہوتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔"

"خدا سلامت رکھے اسے بالکل ثاقب کا ناک نقشہ پایا ہے۔" شبانہ بیگم بولیں۔

"پیشانی تو بالکل میری بیٹی عاصمہ جیسی ہے۔" نسیمہ بیگم نے بہو کا دل رکھنے کی خاطر

کہا۔

لیکن عاصمہ ان باتوں سے بالکل بے نیاز لیٹی اپنے خیالات میں گم تھی۔ وہ سوچ رہی تھی' کیا وہ ثاقب کی خوشیوں کا احترام کر سکے گی؟ کیا وہ اس سے نظر ملاتے وقت اپنی شکست کے احساس کو آسانی سے چھپا سکتی ہے؟ کیا وہ اس زبردستی کی خوشیوں کو گلے لگا کر چوم سکے گی جو قدرت نے اس کی جھولی میں ڈال دی تھیں؟

بھٹکے بھٹکے کمزور خیالات کے زاویے پھیلے تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں سوچا۔ کیا اب اس کی بربادی کے دن بھی قریب آنے والے ہیں۔ کیا اسے بھی شبانہ بیگم کی طرح اپنی دہلیز سے نکلنا پڑے گا؟ کیا ثاقب بھی اس سے نگاہیں پھیر لے گا؟ کیا وہ بھی اپنی اولاد کی خاطر زندہ رہنے پر مجبور رہے گی؟ کیا تپ دق کے مہلک جراثیم اسے بھی کمزور و بے بس اور لاچار پا کر اس کے گرد اپنا جال بننا شروع کر دیں گے؟

عاصمہ ان خدشات کو محسوس کر کے لرز اٹھی۔ ساری جان سے کانپ گئی۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے نسیمہ بیگم کو دیکھا' پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے آنکھیں موند لیں۔

"ثاقب صاحب کہاں ہیں؟" لیڈی ڈاکٹر نے نسیمہ بیگم کو مخاطب کیا۔ "انہیں بلایئے اندر تاکہ بیٹے کے کانوں میں اذان کہہ دیں۔"

"ارے ہاں' میں تو یہ بھول ہی گئی تھی۔ نسیمہ بیگم غرارہ سمیٹتی دوبارہ باہر گئیں اور ثاقب کو اندر لے آئیں۔ ثاقب نے بیٹے کو دیکھا تو فخر سے گردن اونچی کر لی۔ ماں کے کہنے سے انہوں نے جھک کر بچے کے کانوں میں اذان کہی پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر سیدھے ہوئے تھے کہ نرسوں نے انہیں گھیر لیا۔

نسیمہ بیگم نے جلدی سے اٹھ کر دونوں نرسوں کو بیس بیس روپے دیئے' پھر کہا۔

"خدا بچے کو سلامت رکھے' ابھی تو سینکڑوں خوشی کے موقع اور بھی آئیں گے۔"

ثاقب خاموش کھڑے مسکراتی نظروں سے عاصمہ کو دیکھ رہے تھے' وہ اس سے بات کرنے کے لئے بے چین تھے' لیکن ماں اور ساس کی موجودگی میں کچھ نہ کہہ سکے۔ دل میں آرزوؤں کو چھپائے باہر چلے گئے۔

دوسرا دن بھی خوشیوں کے ہنگاموں میں گزر گیا۔ نسیمہ بیگم نے پوتے کی خوشی میں دل کھول کھول کر دونوں ہاتھوں سے خرچ کیا تھا۔ گھر کے ملازموں کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ غریبوں کو کھانا کھلایا گیا۔ یتیم خانے میں بھی دیگیں بھیجی گئیں۔ مسکینوں اور

لاچاروں کو بھی اپنی حیثیت کے مطابق نوازا' پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کرائی۔

ثاقب بھی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ماں کے ساتھ ہر کام میں پیش پیش تھے۔ شبانہ بیگم اور آصف بھی ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ آصف بچہ تھا۔ اس لئے وہ خوشیوں میں بہل گیا تھا' لیکن شبانہ بیگم کا دل رہ رہ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ انہیں اس موقع پر عارف علی کی یاد بُری طرح آ رہی تھی۔ انہوں نے تو بُرے دنوں میں اور پریشانیوں کے پہاڑ تلے دب کر بھی شوہر کی یاد کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ پھر خوشی کے اس موقع پر وہ شوہر کو بھلا کیسے بھول سکتی تھیں۔ بظاہر وہ کام کاج میں خود کو مصروف کئے ہوئے تھیں لیکن جب بھی ذرا تنہائی میسر آتی وہ دو آنسو بہا کر اپنے غموں کے بوجھ کو ذرا ہلکا کر لیتی تھیں۔

شبانہ بیگم بار بار آج ماضی کی حسین یادوں کو دل کے ٹوٹے ہوئے کھنڈرات میں دہرا چکی تھیں۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا جب اسی طرح عاصمہ نے شوہر کے صحن گلشن میں آنکھیں کھولی تھیں تو عارف علی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ انہوں نے بھی تو بڑی دھوم دھام سے اولاد کی خوشی منائی تھی۔ ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا دیئے تھے۔ ہر دن روزِ عید تھا اور ہر رات شب برات لیکن خوشیوں کے یہ دن کتنی جلدی سمٹ کر رہ گئے۔ وقت کی رفتار اور زمانہ کی گردش نے اس قدر جلدی پلٹا کھایا کہ شبانہ بیگم گنگ ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ ان کے آشیانے پر اتنی جلدی بجلی ٹوٹ پڑے گی اور انہیں خود اپنے بسائے ہوئے گلشن سے نکلنا ہو گا لیکن شوہر سے دور رہ کر بھی انہوں نے کبھی گزرے ہوئے دنوں کی حسین یادوں کو بھلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی وہ شوہر کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے تھیں جب سینی ٹوریم کی مدقوق فضا میں اڑتے ہوئے جراثیم ان کے چراغ زندگی کو گل کر دینے کے خواہشمند تھے۔ فاقوں کی حالت میں بھی انہوں نے شوہر کو یاد رکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر آج عارف بھی بیٹی کی خوشیوں میں شریک ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا' لیکن قدرت کو ان کی یہ خوشی منظور نہ تھی۔

دن یوں ہی خوشیوں اور ہنگاموں میں بیت گیا۔ رات آئی تو شبانہ بیگم نے گھر جانے کو کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے بہن!" نسیمہ بیگم بولیں۔ "اب اپنے نواسے کی خاطر جہاں ایک رات رہی ہو وہاں دو چار روز اور رک جاؤ۔"

"یہ بھی اپنا ہی گھر ہے' لیکن میری وجہ سے آپ لوگوں کو زحمت ہو گی۔"

"زحمت کیسی، مجھے تو بے حد خوشی ہو گی۔"

"آتی جاتی رہوں گی۔" شبانہ بیگم نے کہا۔ "میرا گھر بھی تو قریب ہی ہے۔"

"میری تو خوشی یہی تھی جب تک بچے کی چھٹی نہ ہو جائے تم یہیں رہو۔"

"صرف رات رات کی بات ہے صبح دوبارہ آ جاؤں گی۔" شبانہ بیگم بولیں۔ دل تو ان کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ رک جائیں لیکن جب سے آصف نے حالات سے آگاہ کیا تھا اور عاصمہ کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ شوہران کے دروازے تک آ کر واپس لوٹ چکے ہیں انہیں ازحد صدمہ ہوا تھا۔ دل میں اب بھی ایک موہوم سی امید کلبلا رہی تھی کہ شاید کبھی عارف علی دوبارہ آ جائیں............

شاید گزرے ہوئے دن پھر پلٹ آئیں............

اجڑے ہوئے گلشن میں پھر سے بہار آ جائے............

ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ جڑ جائیں............

روٹھی ہوئی خوشیاں پھر سے من جائیں............

نسیمہ بیگم نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا' دو چار بار رکنے کو کہا لیکن جب یہ محسوس کیا کہ شبانہ بیگم جانے پر مصر ہیں تو ہنسی خوشی انہیں رخصت کر دیا۔

ثاقب کاموں میں الجھے ہوئے تھے' لیکن دل بار بار عاصمہ سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ دن میں دو ایک بار وہ عاصمہ کے کمرے میں بھی گئے تھے لیکن مہمانوں کی موجودگی کی وجہ سے الٹے قدموں واپس لوٹ آئے تھے۔

رات گئے جب مہمان رخصت ہو گئے' ہنگامے ختم ہوئے تو ثاقب نے دھڑکتے ہوئے دل سے عاصمہ کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ منہ دوسری طرف کئے لیٹی بچے کو پیار کر رہی تھی۔ اس کے معصوم معصوم گالوں پر اس نے ممتا کے نہ جانے کتنے عقیدت بھرے بوسے ثبت کر دیئے تھے۔ اس کے چہرے کو کئی بار چھو کر دیکھا تھا اور ہر بار اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی معصومیت اور اس کا کمزور وجود عاصمہ کے آہنی عزائم پر طلسم بن کر قابض ہو رہا ہے۔

ثاقب دبے قدموں چلتے ہوئے عاصمہ کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک عاصمہ اور بچے کا خاموش پیار دیکھتے رہے' پھر آہستہ سے مسہری پر بیٹھے تو عاصمہ نے یوں چونک کر کروٹ لی جیسے دریا کی ساکت موجوں پر کسی نے کوئی وزنی شے اچھال دی ہو' جس

کے ٹکراؤ سے بے شمار چھوٹے بڑے دائروں نے اچانک جنم لے لیا ہو۔

عاصمہ نے خود کو ثاقب سے اتنا قریب پایا تو ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی' پھر شوہر کے وجود پر جب مرد کا گمان ہوا تو اس نے جلدی سے نگاہیں پھیرلیں۔

"عاصمہ............!" ثاقب خوشی کے جذبوں سے سرشار تھے۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تمہیں عاصم میاں کی پیدائش پر مبارک باد نہیں دے سکا۔"

"شاید اس لئے کہ آپ اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔" عاصمہ نے ہونٹ سکوڑ کر تلخ آواز میں کہا۔

"ایسا نہ کہو عاصمہ! مجھے تمہاری خوشیاں اپنی مسرتوں سے زیادہ عزیز ہیں۔"

عاصمہ کے دل میں ایک معمولی سا اضطراب بھی نہ پیدا ہوا............

"تم خوش رہو تو میں موت کی تلخیوں کو بھی مسکراتا ہوا گوارا کر سکتا ہوں۔"

عاصمہ کے ذہن پر اس جملہ کا کوئی اثر نہ ہوا............

"امی جان کہہ رہی تھیں کہ عاصم کی پیشانی بالکل تمہاری ہی طرح کشادہ اور خوبصورت ہے۔" ثاقب نے بچے کو دیکھ کر کہا۔

"جانتی ہو کہ کشادہ پیشانی کن باتوں کی علامت ہوتی ہے۔"

"نہیں............" کتنا مختصر سا جواب تھا۔

"پیشانی کا کشادہ ہونا' ذہانت' دور اندیشی اور مستقبل کی تابناکی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے............"

"میں ان فرسودہ باتوں کو نہیں مانتی۔" عاصمہ نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ یہ نہ کہہ سکی کہ جب میری پیشانی بھی کشادہ ہے تو میری قسمت کی تابناکیاں کیوں دبیز اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئی ہیں............

"بزرگوں کے قول کبھی غلط نہیں ہوتے............"

جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

"عاصم نام پسند آیا تمہیں؟"

"آپ کی اولاد ہے' چاہے جس نام سے پکاریں۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

"کیوں............ کیا اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں؟"

عاصمہ کی غزالی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ اس نے خشمگیں

نظروں سے ثاقب کو دیکھا۔ دل چاہا کہ ثاقب کے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹوں کو چھین کر اپنے قدموں تلے روند ڈالے' لیکن نہ جانے کیوں اندرونی احساس سے مغلوب ہو کر رہ گئی۔

"جانتی ہو عاصم کے معنی کیا ہوتے ہیں۔" ثاقب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری زندگی میں جو روشنی بخشتی ہے وہ ہمارے عاصم کی صورت میں ہمیشہ تابندہ بن کر جگمگاتی رہے گی۔"

"رات زیادہ ہو چکی ہے' جا کر سو رہیئے۔" عاصمہ نے بے دلی سے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے' ابھی تو میں نے اپنے بیٹے کو دل بھر کر دیکھا بھی نہیں۔" ثاقب نے کہا۔ مسکراتے ہوئے اٹھے دوسری جانب سے آ کر سوئے ہوئے بچے کو گدے سمیت اٹھا لیا۔ اس کی کشادہ پیشانی کو چوما۔ پھر عاصمہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بچے سے بولے۔

"دیکھ لو عاصم میاں! تمہاری امی ابھی تک مجھ سے روٹھی ہوئی ہیں۔ ذرا ان سے پوچھو تو بیٹے کہ یہ تمہارے ابو سے کیوں ناراض ہیں؟"

عاصمہ نے گھور کر ثاقب کو دیکھا اور ہونٹ چبا کر رہ گئی۔

"تم کسی وقت چپکے سے ان کے کان میں کہنا کہ تمہارے ابو بہت ہی اچھے ہیں اور اچھے آدمیوں سے کبھی ناراض نہیں ہوا جاتا۔"

عاصمہ نے حقارت بھرے انداز میں منہ دوسری طرف پھیرا تو ثاقب کے دل پر دھچکہ سا لگا۔ کچھ دیر تک وہ گنگ سے کھڑے عاصمہ کو دیکھتے رہے' پھر کچھ سوچ کر ننھے عاصم کو بستر پر لٹایا اور گھوم کر سامنے آ گئے۔

عاصمہ کے چہرے پر کربناک سنجیدگی مسلط تھی۔

"عاصمہ!" ثاقب نے اسے نرمی سے پکارا۔

"فرمایئے۔" جواب میں ایک اجنبی جذبہ بھی شامل تھا۔

"ایک بات پوچھوں' جواب دو گی؟" ثاقب کے لہجے میں پیار تھا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے ثاقب! اس وقت مجھے پریشان نہ کریں۔" عاصمہ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا تو ثاقب کے سارے ارمان جیسے دل کی گہرائیوں ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔

"اچھا........." ثاقب تھکے تھکے انداز میں بولے۔ "تم سو جاؤ' پھر کسی وقت باتیں ہوں گی۔"

عاصمہ کے پاس سے ہٹ کر وہ کچھ سوچتے ہوئے بجھے بجھے سے انداز میں جا کر اپنی مسہری پر لیٹ رہے۔ ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آخر وہ کون سی خلیج ہے جو اُن کے اور بیوی کے درمیان حائل ہو رہی ہے۔

فاصلے گھٹنے کی بجائے بڑھتے کیوں جا رہے ہیں؟"

اپنائیت کے رشتوں میں اجنبیت کا یہ احساس کیوں گھل مل گیا ہے؟

"کیوں.........؟"

آخر کیوں.........؟

اور یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی آغوش میں محو خواب ہو کر رہ گئے۔

☆======☆======☆

شیخ عارف علی نے اپنی زندگی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے جو خواب دیکھتے تھے وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ وقت کی ایک ہی کروٹ نے ان بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ حسین محلات جو کمزور ستون پر تعمیر کئے گئے تھے ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو کر رہ گئے۔

ناہید کی بے وفائی نے ان کو زندگی کی ایسی تلخیوں سے دوچار کیا تھا جس میں ندامت کا احساس بھی شامل تھا۔ انہوں نے شبانہ بیگم پر جو ظلم کئے تھے اس کی تلافی اگر وہ اپنی موت کی شکل میں کرتے تو بھی شاید وہ پچھتاوے کم نہ ہوتے جنہوں نے ان کو بے چین کر رکھا تھا۔ انہیں صرف شبانہ بیگم کی جدائی کا غم نہ تھا۔ اس بات کا شدید صدمہ بھی تھا کہ انہوں نے عاصمہ کے معصوم دل کو بھی ٹھیس پہنچائی تھی۔ آصف کی پرورش کی طرف سے بھی کوتاہی برتی تھی۔ اپنے فرائض سے چشم پوشی کی تھی اور یہ سب ناہید کی وجہ سے ہوا تھا جس کی معصوم مگر زہر میں ڈوبی ہوئی باتوں میں آ کر ان کی آنکھوں کے سامنے حسن و جوانی کا سحر پھیل گیا تھا' لیکن ناہید نے خود بھی ان سے بے وفائی کی تھی۔ انہیں زندگی کی تلخیوں سے ہمکنار کر کے خود نئے سہاروں کو اپنانے کی غرض سے نکلی تھی اور اس تلاش میں اس نے ایسی ٹھوکر کھائی کہ سنبھل نہ سکی۔ منہ کے بل زمین پر آ رہی۔

عارف علی کو ناہید سے اب کوئی سروکار نہیں تھا۔ جس روز انہوں نے پرنس اکبر کے قتل کی خبر پڑھی اور ناہید کے ذہنی توازن خراب ہو جانے کی خبر سنی اس روز انہیں بڑا

قلبی سکون ملا۔ اس روز وہ بہت دنوں کے بعد کھل کر ہنسے تھے۔ شاید اس لئے کہ ناہید نے بہت اونچی پرواز کی کوشش میں ناکامیوں کا منہ دیکھا تھا یا پھر اس لئے کہ پرنس اکبر ان کے دشمنوں میں سے تھا' لیکن وہ ان اطلاعات سے زیادہ دیر کے لئے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ انہیں تو اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کا احساس ستا رہا تھا۔

حالات کی رفتار اور وقت کی گردش نے انہیں وقت سے بہت پہلے بڑھاپے کی منزلوں پر لا کھڑا کیا تھا۔ پے در پے ناکامیوں نے ان کی کمر توڑ دی۔ ناہید کی بے وفائی اور شبانہ بیگم اور بچوں کی جدائی کے احساس نے ان کے دل کے سارے ولولوں کو ختم کر دیا تھا۔ اب نہ انہیں کلبوں کے ہنگامے پسند آتے تھے نہ سیر سپاٹے میں کوئی مزہ ملتا تھا' نہ دولت کی جھنکار ان کے ارمانوں کو بھڑکاتی تھی اور نہ امارت کا احساس انہیں کوئی فریب دیتا تھا۔ زندگی پر جیسے ایک بوجھل سا جمود طاری ہو کر رہ گیا تھا۔

بوجھل بوجھل سا جمود..........

جس میں نہ زندگی کی خواہش کو کوئی دخل تھا.......... اور..........

نہ مرنے کی تمنا شامل تھی..........

وقت کی رفتار تھم کر رہ گئی تھی..........

عارف علی ہر وقت اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔ کبھی وہ ماضی پر نظر ڈالتے تو سوئے ہوئے وسوسے ایک لمحے کے لئے تڑپ کر بیدار ہو جاتے۔ حال کی ناکامیاں سامنے آتیں تو وہ تڑپ اٹھتے۔ مستقبل کے گھپ اندھیروں میں جھانکنے کی کوشش کرتے تو سہم اٹھتے۔ تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن بھی تو نظر نہ آتی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا نظر آتا۔ جس میں ان کا ماضی بھی نہ جانے کہاں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

زندگی کی اکتاہٹوں نے انہیں کاروبار کی طرف سے بھی لاپرواہ بنا دیا تھا۔ کئی کئی دنوں تک وہ گھر سے باہر بھی نہ نکلتے' لیکن قدرت نے انہیں اب بھی ڈھیل دے رکھی تھی۔ ان کا پرانا اور نمک حلال مینجر جب انہیں گھر پر آ کر یہ بتاتا کہ کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے تو وہ خوش ہونے کے بجائے جھلا کر کہتے۔

"آگ لگا دو اس کاروبار میں جس نے میری خوشیوں کو مجھ سے چھین لیا ہے۔"

مینجر چلا جاتا' تو وہ گھنٹوں اضطرابی کیفیت میں کمرے میں ٹہلا کرتے۔ دیوانوں کی طرح بال نوچتے' پاگلوں کی طرح خود اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے اور جب تھکن کا

احساس شدید ہو جاتا تو شبانہ بیگم کی خاموش تصویر کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے۔

"شبانہ! تم آج بھی خاموش ہو' تم آج بھی مسکراتی نظروں سے میرے چہرے کو تک رہی ہو۔ تمہاری پیشانی پر آج بھی کوئی بل نظر نہیں آتا۔ خدا کے لئے اپنی اس خاموشی کے طلسم کو توڑ ڈالو۔ تم مجھ پر لعن طعن کیوں نہیں کرتیں۔ مجھے گالیاں کیوں نہیں دیتیں۔ میری موت کی دعائیں کیوں نہیں کرتیں۔ میں تم کو تمہاری وفاؤں کا واسطہ دیتا ہوں کہ اپنے ہونٹوں کی اس دلآویز مسکراہٹ کو نفرت میں بدل ڈالو۔ تم اپنی نگاہوں کے زاویے کو بدل کیوں نہیں لیتیں۔ تمہاری پیشانی پر بل کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ تم اس تابناک پیشانی پر اتنی سلوٹیں کیوں نہیں پیدا کر لیتیں کہ مجھے تمہاری نفرت کا احساس ہو سکے اور میں سکون کی موت مر سکوں.........."

بڑی دیر تک وہ یوں ہی آنکھیں پھاڑے بیوی کی تصویر کے سامنے کھڑے باتیں کرتے رہتے۔ پھر جب اپنی سرد مہریوں کا خیال آتا تو سسک سسک کر رونے لگتے۔ تڑپ تڑپ کر اپنی موت کی دعائیں مانگتے پھر نڈھال ہو کر بستر پر گر جاتے۔

آج بھی وہ اسی کیفیت میں مبتلا تھے کہ ملازم نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھا اور انہیں عبدل کے آنے کی اطلاع دی۔

"عبدل کو یہیں بھیج دو۔" انہوں نے ملازم سے کہا۔

"بہتر ہے۔" ملازم نے سر جھکا کر جواب دیا۔ پھر الٹے قدموں باہر چلا گیا۔

عبدل کی آمد کی اطلاع نے عارف علی کی بے چینیوں میں اضافہ کر دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ نہ جانے عبدل کیوں آیا ہے' کیا وہ ان کے لئے کوئی نئی اطلاع لے کر آیا ہے لیکن وہ اطلاع کیسی ہو گی؟

خوشی کا کوئی پیغام..........؟

یا..........

صدموں میں ایک اور اضافہ؟

عبدل نے کمرے میں داخل ہو کر عارف علی کو سلام کیا تو ان کی آنکھوں میں بے چینی کا احساس چھلک پڑا۔ جلدی سے پوچھا۔

"کیا اطلاع لائے ہو عبدل!"

"ادھر سے گزر رہا تھا سرکار! سوچا آپ سے ملتا چلوں۔"

"اچھا کیا تم نے۔" عارف علی نے اطمینان کا سانس لیا پھر بولے۔ "خیریت سے تو ہو؟"

"آپ کی دعا ہے سرکار!"

"آصف کا کیا حال ہے۔" عارف علی نے دبی زبان میں بیٹے کی خیریت دریافت کی۔

"بھلے چنگے ہیں وہ تو' امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"خدا مبارک کرے اسے۔" عارف علی نے کانپتی آواز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ "عاصمہ کی بھی کوئی اطلاع ہے تمہارے پاس؟"

"اسی سلسلے میں تو مبارکباد دینے حاضر ہوا ہوں۔"

"مبارکباد کیسی عبدل!"

"عاصمہ بٹیا کے ہاں لڑکا ہوا ہے سرکار! بڑی دھوم دھام ہوئی تھی بچے کی خوشی میں............"

عارف علی کا دل اندر ہی اندر مسوس کر رہ گیا۔ نظریں جھکا کر اپنی بدنصیبی پر غور کرنے لگے۔ بیٹی کے ہاں اولاد پیدا ہوئی اور انہیں اطلاع بھی نہ ہوئی۔ وہ اولاد کی خوشیوں میں شریک بھی نہ ہو سکے تھے۔ دل تڑپ کر رہ گیا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے سرکار!" عبدل نے پوچھا۔ "کیا آپ کو نواسے کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"میں بہت خوش ہوں عبدل' لیکن افسوس صرف اس بات کا ہے میں ان خوشیوں میں شرکت بھی نہ کر سکا۔"

عبدل نے عارف علی کے چہرے پر غموں کی پرچھائیں لرزتی دیکھیں تو کوئی جواب نہ دیا۔ خود بھی افسردہ ہو گیا۔ کئی لمحات یوں ہی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر عبدل نے دبی زبان میں کہا۔

"سرکار! میری رائے مانئے تو اب آپ آصف میاں اور ان کی والدہ کو یہیں لے آیئے۔"

"میں بھی اکثر یہی سوچتا رہتا ہوں' لیکن............"

"لیکن کیا سرکار!"

"میرا خیال ہے کہ شبانہ مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"تم نے گھر کا حال نہیں بتایا' شبانہ تو خوش ہے نا؟"

عبدل نے عارف علی کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر نظریں بچانے کی کوشش کی تو عارف علی کا دل کسی انجانے جذبے سے دھڑک اٹھا۔ کچھ لمحات تک عبدل کی خاموشی کو پڑھنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ پھر پوچھا۔

"کیا بات ہے عبدل! تم نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا؟"

"کیا بتاؤں سرکار! سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہونے والا ہے؟"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"بات تو خاص ہی ہے سرکار' لیکن سن کر آپ کو دکھ ہو گا۔"

"عبدل!" عارف علی نے مضطرب ہو کر کہا۔ "خدا کے لئے جو کچھ بتانا چاہتے ہو جلدی بتا ڈالو۔ مجھے الجھن میں مت مبتلا کرو۔"

"بڑی سرکار کی طبیعت آج کل بہت زیادہ خراب ہے سرکار!" عبدل نے دبی زبان میں کہا' لیکن لہجے کی یہ نرمی بھی عارف علی کے وجود پر بم بن کر گری تھی۔ بیوی کی بیماری کی اطلاع سن کر ان کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ پہلو بدل کر بولے۔

"کیا خدانخواستہ ابھی تک وہ تپ دق کے مرض میں مبتلا ہے۔"

" سرکار! اس بیماری کا علاج تو ہو گیا ہے' لیکن اب تو نہ جانے انہوں نے اپنی زندگی کو کیا روگ لگا لیا ہے کہ روز بروز گھلتی جا رہی ہیں۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" عارف علی اٹھ کر پریشانی کی کیفیت میں ٹہلنے لگے۔"

"آج ہی تو مجھے خبر ملی تھی سرکار!"

"کیا آصف اپنی ماں کا علاج نہیں کرا رہا ہے؟"

"آصف میاں بے چارے تو دونوں وقت ڈاکٹر کو لاتے ہیں' مگر کوئی دوا فائدہ نہیں کر رہی ہے۔ نہ جانے انہیں کیا غم کھائے چلا جا رہا ہے۔"

"عبدل!" عارف علی ایک سرد آہ بھر کر بولے۔

"میں جانتا ہوں کہ شبانہ کو کیا غم کھائے جا رہا ہے۔"

"پھر آپ اس کا علاج کیوں نہیں کرتے سرکار!"

"جو خود بیمار ہو وہ دوسرے کا بھلا کیا علاج کرے گا۔" عارف علی نے لٹے ہوئے مسافر کی طرح اداس آواز میں کہا۔

"کیا بیماری ہے بڑی سرکار کو؟" عبدل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"شبانہ کو وفا نبھانے کا مرض لاحق ہے' وہ تیرہ سال تک میری چیرہ دستیوں کا شکار بنتی رہی' لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے کبھی مجھے بُرا نہیں سمجھا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ آج بھی روزِ اوّل کی طرح مجھ سے پیار نبھا رہی ہے۔" عارف علی کی آواز بھرا گئی۔ آنسو پونچھ کر بولے۔ "تم ان باتوں کو نہ سمجھ سکو گے عبدل' لیکن میں جانتا ہوں کہ میری بے مروتی سے شبانہ کے دل میں جو داغ پیدا ہوئے ہیں وہ ایک مہلک گھاؤ کی طرح پک کر رِسنے لگے ہیں' مگر وہ آج بھی وفا کی ڈور تھامے ہوئے ہے۔"

"آپ بڑی سرکار کو منا کیوں نہیں لاتے؟"

"میں جانتا ہوں کہ اگر میں شبانہ کے پاس سوالی بن کر جاؤں تو وہ مجھے خالی ہاتھ نہیں واپس کرے گی۔ وہ اپنی زندگی کی سسکتی ہوئی آخری خوشیوں کو بھی میری جھولی میں ڈال دے گی لیکن.........."

"لیکن کیا سرکار!" عبدل نے عارف علی کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" عارف علی نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "میں ایک بار پھر تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔ زندگی کی خوشیاں کسے عزیز نہیں ہوتیں' لیکن کبھی کبھی ان خوشیوں کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو بہت بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ مجھے بھی کسی ایسے ہی وقت کا انتظار ہے۔"

"آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں سرکار! مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جائے اور.........."

"عبدل!" عارف علی چیخ اٹھے۔ شدتِ جذبات سے ان کا چہرہ دہک اٹھا۔ دماغ کی نسیں پھول گئیں۔ ساری جان سے لرز کر بولے۔ "خدا کے لئے تم کوئی ایسی بُری فال زبان پر مت لانا' جسے سن کر میرا کلیجہ پھٹ جائے اور میں اپنی غلطیوں کی تلافی بھی نہ کر سکوں.........."

عبدل نے کوئی جواب نہ دیا۔ عارف علی کے چہرے پر پھیلی وحشت اور بے کسی کے

تاثرات دیکھ کر وہ سہم گیا تھا۔

کئی لمحات یوں ہی خاموشی میں گزر گئے۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ عارف علی اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"تم مجھے شبانہ کی خیر خبر دیتے رہنا عبدل! میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم اس آڑے وقت میں میرے کام آ رہے ہو۔"

"خادم ہوں آپ کا سرکار!"

عبدل کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا تو عارف علی ایک بار پھر بیوی کی تصویر کے سامنے آ کر اس کی خاموشی سے ہم کلام ہو گئے۔ دل کا درد بڑھا تو وہ بے چین ہو کر رو دیئے۔ آنسو سیلاب کی طرح ان کی آنکھوں سے بہتے رہے۔ جیسے آج ایک شوہر کی روٹھی ہوئی محبت میں پیار کی طغیانی آ گئی تھی۔

وہ شبانہ بیگم کی تصویر سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے رہے۔

بِلک بِلک کر فریاد کرتے رہے..........

تڑپ تڑپ کر آہیں بھرتے رہے.......... لیکن..........

ان کی یہ کیفیت شبانہ بیگم کے غموں کا علاج تو نہ تھی..........!!

☆======☆======☆

ثاقب نے متعدد بار عاصمہ کے دل میں جھانک کر اس کے غموں کو سمجھنا چاہا۔ بارہا انہوں نے پیار و محبت سے عاصمہ سے اس طویل خاموشی اور ناراضگی کی وجہ پوچھی' لیکن انہیں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ عاصمہ یا تو خاموش رہ کر انہیں ٹال دیتی یا پھر مبہم اشاروں میں دو چار جملے ایسے کہہ جاتی جو ثاقب کی الجھنوں میں مزید اضافے کا باعث بن جاتے۔

ننھا عاصم اب چھ ماہ کا ہو گیا تھا۔ بڑا تندرست اور ذہین بچہ تھا۔ دیکھنے والے اسے ایک سال کا کہتے تھے۔ سارا دن وہ کمرے میں بچھی اجلی چاندنی پر اِدھر اُدھر رینگتا رہتا۔ ثاقب نے اس کے لئے بے شمار کھلونے خرید دیئے تھے جنہیں وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے دن بھر الٹتا پلٹتا رہتا۔ شکل و صورت میں وہ بالکل ثاقب کی بنی بنائی تصویر تھا۔

ثاقب دن بھر کے تھکے ماندے آتے تو بچے کو گود میں لے کر کھیلا کرتے۔ دن بھر کی تھکن کا احساس عاصم کی معصوم شرارتوں میں جیسے ختم ہو جاتا۔ اولاد کی بے رخی سے سرشار ہو کر وہ اپنے ذہن کے سارے بوجھ بھول جاتے' لیکن دل میں ایک خلش

تھی جو انہیں ہر وقت بے چین کئے رہتی تھی۔ وہ بچے سے کھیلتے ہوئے' کپڑے تبدیل کرتے ہوئے' ناشتہ کرتے ہوئے اور کھانے کے دوران بھی کنکھیوں سے عاصمہ کو دیکھتے رہتے' لیکن عاصمہ ہر وقت اپنی ہی دنیا اور خیالات میں گم ان سے بے نیاز نظر آتی۔

ثاقب کو جہاں عاصمہ کی بدلی ہوئی کیفیت نے پریشان کر رکھا تھا وہاں اس بات کا افسوس بھی تھا کہ وہ عاصم کو بھی اپنی محبت سے نوازنے میں کوتاہی برت رہی ہے۔ بچہ کبھی بھوک سے روتا اور وہ عاصمہ سے اسے دودھ پلانے کو کہتے تو وہ چپ چاپ بیٹھی ناول پڑھتی رہتی۔ عاصم کے کپڑے گندے رہتے' وہ دبی زبان میں کپڑے تبدیل کرنے کو کہتے لیکن عاصمہ آئینہ کے سامنے بیٹھی سنگھار کرتی رہتی۔ غرضیکہ ثاقب کی بے چینیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ عاصمہ کی بے رُخی ان کے لئے ایک ایسا معمہ بن کر رہ گئی تھی جس کا حل تلاش کرتے کرتے وہ تھک ہار گئے تھے' اور پھر انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر کے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اِدھر کچھ دنوں سے تو عاصمہ کی حالت بہت زیادہ سیمابی بن گئی تھی۔ ماں کی گرتی ہوئی صحت نے اس کو پارے کی طرح مضطرب کر دیا تھا۔ وہ سارا سارا دن ماں کے پاس بیٹھی ان کی دلجوئی کرتی رہتی۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے دوا پلاتی۔ آصف کو تلقین کرتی کہ ماں کی طرف سے کوئی کوتاہی یا لاپرواہی نہ ہو۔ شام کو جب ثاقب کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ دل پر جبر کر کے ماں کو خدا کے حوالے کر کے واپس چلی آتی' لیکن تمام رات بے چین رہتی۔ اس کا دل ماں کی طرف لگا رہتا۔

آج بھی جب وہ ماں سے رخصت ہو کر گھر پہنچی تو اس کا خیال تھا کہ ثاقب ابھی نہ آئے ہوں گے' لیکن اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ثاقب سامنے ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور عاصم ان کی گود میں پڑا تھا۔ بچے کو بے وقت سوتے دیکھ کر اس کی ممتا بے چین ہو گئی۔ اس کا دل چاہا دوڑ کر عاصم کو ثاقب کی گود سے چھین کر اپنی آغوش میں چھپا لے' لیکن کمرے میں نسیمہ بیگم کی موجودگی کی وجہ سے اسے اپنی خواہش دبا دینا پڑی۔

نسیمہ بیگم نے بہو کو آتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"اب تمہاری امی کی طبیعت کیسی ہے بیٹی؟"

"ابھی زندہ ہیں۔" عاصمہ کا دل بھر آیا۔ اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرے

چھلک آئے۔

"ایسی باتیں کیوں کرتی ہو بیٹی' خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔" نسیمہ بیگم نے کہا۔ "تم آ گئی ہو تو اب بچے کے پاس بیٹھو۔ میں کھڑے کھڑے شبانہ بہن کو دیکھ کر ابھی آتی ہوں۔"

"بچے کو کیا ہوا امی جان!" عاصمہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"بخار آ گیا ہے۔"

"بخار.......... کب.......... کیسے!" وہ مضطرب ہو کر بولی۔

"میں نے ثاقب کو بلوا کر ڈاکٹر کو دکھلا دیا ہے۔ موسمی بخار ہے' کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔"

نسیمہ بیگم کمرے سے چلی گئیں تو اس نے نظر اٹھا کر ثاقب کو دیکھا' اس نے سوچا تھا کہ ثاقب یقیناً اس کی غیر حاضری پر خفا ہوں گے' لیکن ثاقب سے نظریں چار ہوئیں تو وہ جیسے مجرم بن کر رہ گئی۔ ثاقب کی نگاہوں میں خفگی کے بجائے پیار جھلک رہا تھا۔ پیشانی پر ناگواری کا کوئی بل نہ تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے عاصمہ کو دیکھ رہے تھے..........

ان آنکھوں میں کس قدر اپنائیت تھی..........

ہمدردی کا بھرپور جذبہ موجود تھا..........

چہرے پر وہی سادگی اور وہی معصومیت نظر آ رہی تھی..........

عاصمہ نے جلدی سے ثاقب کے چہرے سے نظر ہٹا کر بچے کی طرف دیکھا' جس کا چہرہ بخار کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کشمکش میں گرفتار اپنی جگہ کھڑی کبھی عاصم اور کبھی ثاقب کو دیکھتی رہی۔ ذہن میں ایک نیا جذبہ سر ابھار رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی

عاصم کا چہرہ بخار کی شدت سے تپ رہا ہے..........

وہ گھر سے غیر حاضر تھی..........

پھر..........

ثاقب نے کسی خفگی کا اظہار کیوں نہیں کیا..........؟

اسے دیکھ کر برہمی کے اظہار کے طور پر ان کی پیشانی پر بل کیوں نہیں

پڑے............؟

انہوں نے نفرت سے نگاہیں کیوں نہ پھیرلیں............؟

اسے سرزنش کیوں نہیں کی............؟

اس کی لاپرواہی پر کچھ بولے کیوں نہیں............؟

ان کی نگاہوں میں نفرت کے بجائے پیار کے ساغر کیوں چھلک رہے تھے............

حقارت سے نگاہیں پھیرلینے کے بجائے وہ کیوں اسے محبت بھری نظروں سے گھور رہے تھے............

کیا انہیں اس سے کوئی شکایت نہ تھی............؟

کوئی شکوہ کوئی گلہ نہ تھا............؟

عاصمہ بت بنی کھڑی اپنی سوچوں میں گم رہی' اولاد کی بیماری اور شوہر کی خاموشی نے آج اسے ایک نئی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ کیا اب تک اس نے ثاقب کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے اس میں حق بجانب تھی یا محض خود کو فریب دے کر دل کو بہلاتی رہی تھی' اور اگر یہ بہلاوا نہیں تھا تو پھر وہ ثاقب کی نگاہوں میں پیار کی ایک جھلک پا کر مجرم سی کیوں بن گئی تھی۔ اس کے سینے میں آج نفرت کا جذبہ کیوں سرد پڑ گیا تھا۔ وہ حقارت کا اظہار کیوں نہ کر سکی تھی۔ ثاقب کو یوں چپ چاپ دیکھ کر اُس کے دل میں ہمدردی نے کیوں سر ابھارا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کیوں اُبھر آیا تھا کہ وہ اب تک ثاقب سے ناانصافی کرتی رہی ہے۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں ثاقب کے لئے پیار کا ایک معمولی سا جذبہ کیوں ابھرا تھا۔ یہ خواہش آج کیوں بیدار ہوئی تھی کہ وہ دوڑ کر ثاقب کے قدموں میں سر رکھ دے اور ندامت کے آنسو بہا کر کہے............

"ثاقب! میں نے آج تک تم پر بے انتہا ظلم کئے ہیں مجھے معاف کر دو۔"

آخر وہ کون سی طاقت تھی جس نے آج اس کے اعصاب پر قابو پا لیا تھا۔ بڑی دیر تک وہ اپنے خیال میں گم رہی۔ پھر ثاقب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو خیالات کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ وہ چونکی جیسے کچھ سہانے خواب پریشان ہو گئے ہوں۔

"امی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک نہیں ہے۔" عاصمہ نے دبی زبان میں کہا۔

"میں نے امی جان سے کہا تھا کہ وہ ہسپتال میں داخل ہو جائیں' وہاں زیادہ بہتر طور

پر دیکھ بھال ہو سکتی ہے۔" ثاقب کے لہجے میں بے پناہ خلوص تھا۔

"آصف ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ کسی اچھے ہسپتال کے اخراجات کا بوجھ اٹھا سکے۔" عاصمہ نے بجھے ہوئے الفاظ میں آہستگی سے جواب دیا۔

"عاصمہ!" ثاقب چوٹ کھائے ہوئے انداز میں بولے۔ "یہ تم مجھے غیر کب سے سمجھنے لگی ہو؟"

"میں نے غیریت کی کوئی بات نہیں کی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں بھی تمہاری امی کو امی ہی کہتا ہوں۔ کیا میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے؟"

"عاصم کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے ثاقب کی بات اڑانی چاہی۔

"تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

عاصمہ چپ رہی۔ آگے بڑھ کر بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو تڑپ اٹھی۔ عاصم کا جسم آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے ثاقب کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگایا اور بے چینی سے ثاقب کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟"

"موسمی بخار............ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک جاتا رہے گا۔"

"کوئی دوا نہیں دی ڈاکٹر نے؟"

"انجکشن لگایا ہے............ رات کو خود دوبارہ دیکھنے آئے گا۔"

"اس کا جسم تو آگ کی طرح دہک رہا ہے۔" وہ بچے کو سینے سے لگائے لگائے مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

ثاقب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عاصمہ کو بغور دیکھتے رہے۔ عاصم کے لئے ممتا کی تڑپ کو دیکھ کر آج انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ آج عاصمہ نے اولاد کی طرف سے کوتاہی نہیں برتی تھی۔ اس نے از خود اولاد کی کیفیت دریافت کی تھی۔ پیار سے اسے گود میں لے کر بڑی محبت سے چوما تھا۔ اس نے آج یہ نہیں کہا تھا کہ۔ "بچہ ہے' ہر وقت کی دیکھ بھال بھلا کون کر سکتا ہے۔"

عاصمہ بچے کو مسہری پر لٹا کر تیزی سے ثاقب کی طرف مڑی تھی۔

"ملازم سے برف منگوا دیجئے۔"

"برف کیا کرو گی؟"

"عاصم کے لئے چاہئے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "پیشانی پر برف کی پٹیاں رکھنے سے اس کے بخار کی شدت کم ہو جائے گی۔"

ثاقب جواب دینے کے بجائے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ ملازم برف لے آیا تو عاصمہ نے جلدی سے سفید کپڑے کی دو پٹیاں بنائیں اور انہیں برف پر رکھ کر جلدی جلدی عاصم کی پیشانی پر بدلنے لگی۔ ثاقب قریب کھڑے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

آج وہ اولاد کے لئے کس قدر مضطرب نظر آ رہی تھی۔

کیسی بے چینی طاری تھی اس کے چہرے پر............

ممتا کی تڑپ کا حُسن کیسا نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا............

وہ خود کو بھول کر بچے میں محو ہو گئی تھی............

کچھ دیر تک برف کی پٹیاں بدلتے رہنے کے بعد اس نے عاصم کا ٹمپریچر لیا تو اس کو قدرے سکون آیا۔ پٹیوں کو برتن میں رکھ کر وہ غنودگی کی کیفیت میں آنکھیں بند کئے ہوئے معصوم عاصم کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگی اور ایسا کرتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ چہرے پر غم انگیز سنجیدگی طاری تھی۔ آنکھیں جھپکائے بغیر وہ بچے کو دیکھے جا رہی تھی۔

"عاصمہ!"

ثاقب کی آواز سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ یوں چونکی جیسے اب تک اسے وہاں ثاقب کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ نظر اٹھا کر اس نے ثاقب کو دیکھا' پھر جلدی سے نگاہیں جھکا کر بچے کو دیکھنے لگی۔

"عاصمہ!" ثاقب نے اسے دوبارہ آواز دی۔

"جی۔" اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

"کیا ٹمپریچر ہے عاصم کا؟"

"ایک سو۔"

"پریشان مت ہو' صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ چپ رہی تو ثاقب نے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے آج میری خوشیوں میں برابر کا حصہ لیا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" اس نے نظریں اٹھا کر ثاقب کو گھورا' وہ اس جملہ کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ عاصم کے بخار کی شدت نے جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو سلب کر لیا تھا۔

"میرا اشارہ بچہ کی طرف تھا۔ جو ہماری مشترکہ خوشیوں کا نتیجہ ہے۔"

"دکھ درد میں تو انسان غیروں کے کام بھی آ جاتا ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ جی کڑا کر کے اس نے بچے کی پیشانی پر ہاتھ پھیر لیا۔

ایک مرد کے سامنے وہ بھلا اپنی کمزوری کا اظہار کیسے کر سکتی تھی۔

اس کی ممتا تڑپ کر رہ گئی۔

درد کا احساس جاگ رہا تھا لیکن اس نے اپنے سینے پر صبر کی سل جمالی تھی۔

آنکھوں میں بے چینی کا جذبہ سلگ رہا تھا مگر وہ خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کی سعی کر رہی تھی............

اور............

اس کشمکش میں ماضی کی تلخیوں نے اس کے اندر کی عورت کو ایک بار پھر جگا دیا۔ وہ ثاقب کے جذبے کو طنز کا رنگ دے کر اندر ہی اندر سلگ اٹھی تھی۔ ہونٹ اتنی سختی سے دانتوں تلے دبائے کہ خون کی سرخیاں جم کر ابھر آئیں۔

"عاصمہ!" ثاقب بیوی کے جواب پر تڑپ کر بولے۔ "کیا تمہیں خود اپنے خون سے بھی نفرت ہو گئی ہے؟"

"جس خون میں زبردستی کا رنگ شامل ہو' میں اسے اپنا کہنے کو تیار نہیں ہوں۔" وہ تڑپتے ہوئے جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ گئی۔

"ایسا مت سوچو عاصمہ! ایسا مت کہو۔" ثاقب نے بے چین ہو کر کہا۔ "تم نے عاصم کو اپنا خون جگر پلا کر اس کی پرورش کی ہے۔"

"میں اس کے لئے مجبور تھی............"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے عاصمہ!"

"میں پاگل ہو گئی ہوں۔" وہ غصے سے تلملا کر بولی۔ "تم مجھ سے نفرت کیوں نہیں کرتے۔ حقارت سے ٹھوکر مار کر اسی دنیا میں کیوں نہیں پھینک دیتے جہاں سے موتی سمجھ کر اٹھا لیا تھا۔"

"تم میرے لئے اب بھی ہیرا ہو عاصمہ!" ثاقب نرم پڑ گئے۔ عاصمہ کے چہرے کی کیفیت کا اندازہ لگا کر انہوں نے بات ختم کر دینی چاہی۔

"نہیں.......... میں ہیرا نہیں بلکہ پتھر ہوں۔ مجھے کسی کی ہمدردیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے زندگی کی کوئی خواہش نہیں.......... میں زندہ رہنے پر مجبور کر دی گئی ہوں۔ خدا کے لئے میری ان مجبوریوں کا مضحکہ مت اڑاؤ.......... میں کسی کی ماں نہیں ہوں.......... کسی کی اولاد نہیں ہوں.......... مجھے اس دنیا سے نفرت ہے.......... شدید نفرت..........!"

عاصمہ جذبات کی روانی میں کہے جا رہی تھی اور ثاقب یوں اُسے دیکھ رہے تھے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ جیسے انہیں اپنے کانوں سے سنے ہوئے ان جملوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جیسے وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔

کئی لمحات تک وہ گنگ سے بنے کھڑے عاصمہ کو حیرت سے تکتے رہے۔ پھر نظریں جھکا کر آہستہ سے مضمحل آواز میں بولے۔

"مجھے افسوس ہے عاصمہ کہ تمہیں میری باتوں سے دکھ پہنچا۔"

جواب میں عاصمہ تیزی سے اٹھی۔ گھور کر ثاقب کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ عاصم پر نظر ڈالے بغیر پلٹی۔ بک شیلف سے ایک کتاب کھینچی اور دور پڑی کرسی پر بیٹھ کر اس کے اوراق پلٹنے لگی۔ ذہن بچے میں اُلجھا ہوا تھا' لیکن وہ ثاقب کی موجودگی میں دیدہ و دانستہ دل پر جبر کئے اسے نظرانداز کر رہی تھی۔

"عاصمہ!" ثاقب نے رندھی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "اگر تمہیں میری ذات سے کوئی صدمہ پہنچا ہے تو اس کی سزا مجھ کو دے لو' معصوم بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کتاب کے اوراق جلدی جلدی پلٹنے لگی۔ ثاقب اس سرد مہری پر تڑپ کر رہ گئے کچھ دیر تک بت بنے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا امی کو دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"میں امی کو ہسپتال میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔" وہ کتاب بند کر کے تیزی سے بولی۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ان کے پاس ہسپتال کے اخراجات برداشت کرنے کو پیسہ نہیں ہے۔"

"میں انہیں رضامند کر لوں گا۔"

"لیکن میں اسے پسند نہیں کروں گی۔" عاصمہ نے نفرت سے جواب دیا۔

"تمہاری مرضی۔" ثاقب نے مصلحتاً کہا۔ پھر سر جھکا کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

عاصمہ ہاتھ میں دبی کتاب دور پھینک کر دوڑتی ہوئی عاصم کے پاس آ گئی۔ معصوم بچے کو سینے کی گہرائیوں میں لے کر اس نے سینکڑوں پیار کر ڈالے۔ عقیدت سے اس کی پیشانی چومی' اس کے تپتے ہوئے گالوں پر اپنے لرزتے کانپتے ہونٹ رکھ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"عاصم.......... میرے بچے.......... میری زندگی.......... مجھے معاف کر دو۔ میں حالات سے مجبور ہو کر تم سے دور چلی گئی تھی میرے لعل' ورنہ ایسا کبھی نہ کرتی۔ اب ایک تمہارا ہی سہارا تو ہے جسے تھام کر میں زندہ رہنے میں خوشی محسوس کرنے لگی ہوں۔ کہیں تم بھی مجھ سے روٹھ نہ جانا۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک تمہارے ہی دم سے تو ہے میرے معصوم عاصم' مجھے معاف کر دینا۔"

اور..........

پھر وہ بچے کو مسہری پر لٹا کر اس کے برابر لیٹ گئی۔ اسے اپنی آغوش میں لئے بڑی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ پھر اس کے ملائم ملائم گالوں پر چہرہ رکھ کر سسکنے لگی۔ آنسوؤں کا سیلاب' جسے اس نے ثاقب کی موجودگی میں ضبط کی بندشوں سے روک رکھا تھا تنہائی کا سہارا پا کر بے اختیار امڈ آیا تھا۔

رو لینے سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو وہ بچے کو سینے سے لگائے ثاقب کے بارے میں سوچنے لگی۔ ثاقب نے کس قدر خلوص سے شبانہ بیگم کا علاج کرانے کی پیشکش کی تھی۔ جسے اس نے نفرت سے ٹھکرا دیا تھا۔ عاصم کے سلسلے میں بھی اس نے ہمیشہ ثاقب کی موجودگی میں لاپرواہی سے کام لیا تھا' لیکن اس نے کوئی بازپُرس نہیں کی تھی..........

روزِ اوّل سے وہ ماضی کے زخموں کو تقویت دینے کی خاطر ثاقب سے نفرت کا اظہار کرتی رہی تھی' لیکن اس نفرت کے جواب میں اسے کیا ملا تھا۔

خاموشی..........

اپنائیت کا اظہار ....

ثاقب کی آنکھوں میں رہ رہ کر مچل اٹھنے والی محبت ....

اس کے چہرے پر نظر آنے والی سدا بہار معصومیت اور سادگی میں کبھی کوئی فرق نہ آیا تھا..........

وہ جب بھی مرد سے نفرت کا اظہار کرتی ثاقب ہنس کر ٹال جاتا۔

کبھی اس نے پلٹ کر کوئی جواب نہ دیا

ہمیشہ اس کی خوشیوں کو سہارا دینے کے لئے بے چین رہا۔

اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک سوال ابھرا۔ "کیا وہ ثاقب کو معاف کردے.........." اور اس سوال پر وہ بے چین ہو کر رہ گئی۔ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی تو گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔

نفرت کا وہ احساس جو اس کی عمر کے ساتھ ساتھ پختگی کی منزلیں طے کرتا رہا تھا' بھلا اتنی آسانی سے کیسے فنا ہو سکتا تھا۔

☆======☆======☆

شبانہ بیگم کی حالت روز بروز گرتی جارہی تھی۔

جب سے انہوں نے ناہید کے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا اور آصف کی زبانی ان کو یہ معلوم ہوا تھا کہ عارف علی ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کے خواہشمند ہیں' تو ان کے دل کے زخموں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ عاصمہ کی باتوں سے بھی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عارف علی باپ بن کر نہیں بلکہ سوالی بن کر ان کی دہلیز تک آئے تھے اور خالی جھولی لے کر واپس لوٹ گئے۔

اس احساس نے شبانہ بیگم کے ذہن پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ اپنی حالت نہ سنبھال سکیں' اور پٹی سے لگ کر رہ گئیں۔ انہیں اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ ان کی ساری قربانیاں اکارت ہو گئیں۔ انہوں نے کبھی شوہر کو کسی بات پر ٹوکا نہ تھا۔ ہمیشہ شوہر کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ عارف علی نے بیشک ان پر ظلم کئے تھے' ان کی وفاؤں کو بھلا کر انہیں زندگی سے دور کر دیا تھا' لیکن شبانہ بیگم نے انہی کی یاد کو دل سے لگا کر جینے کا ایک سہارا ڈھونڈ نکالا تھا۔ تیرہ چودہ سال تک مصائب و آلام جھیلے۔ موت اور زندگی کی کشمکش برداشت کی' لیکن کبھی شوہر کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ

نکالا۔ ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھ کر ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہیں کہ کبھی شوہر کو دکھ نہ پہنچے۔ شوہر کے ہر حکم کو انہوں نے ایمان سمجھ کر اپنایا تھا۔ پھر بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ شوہر کو اپنے دروازے سے مایوس لوٹا دیتیں۔ ہرچند کہ وہ اس سلسلہ میں ذمہ دار نہ تھیں لیکن یہ احساس ہی انہیں مار ڈالنے کے لئے کافی تھا کہ عارف علی کو اپنی زندگی میں کسی بات میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

اکثر وہ تنہائیوں میں شوہر کے تصور کو مخاطب کر کے کہہ چکی تھیں..........!

"میرے سرتاج! مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی خطاوار ہوں۔ آپ مجھ سے ملنے آئے اور گردن جھکا کر واپس چلے گئے۔ کاش میں گھر پر ہوتی تو آپ کی خوشی کی خاطر اپنی زندگی بھی آپ کے قدموں پر نچھاور کر دیتی۔ میں تو آج تک آپ ہی کی یادوں کے سہارے زندہ ہوں۔ آپ دور رہ کر بھی ہمیشہ میرے بہت قریب رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی پرستش کی ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے مجازی معبود کو مایوس کر دیتی۔"

کبھی جب درد کا احساس بڑھ کر زندگی کی سرحدوں کو چھونے لگتا تو وہ تڑپ کر کہتیں..........

"میرے مالک! مجھے اتنی مہلت اور دے دے کہ میں شوہر کی اس غلط فہمی کو دور کر سکوں جو ان کے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ خداوندا! زندگی کو موت کے چنگل سے اس وقت تک کے لئے نجات دلا دے جب تک میں اپنے شوہر سے معافی نہ مانگ لوں۔ ورنہ یہ احساس مرنے کے بعد بھی مجھے تڑپاتا رہے گا۔ میرے مولا! اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے میں صرف اتنی مہلت اور عطا کر دے کہ میں شوہر کے قدموں میں سر رکھ کر انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکوں۔ ان خطاؤں کی معافی مانگ سکوں جو میری اولادوں سے ناتجربہ کاری کی بنا پر سرزد ہو گئی ہیں۔ میرے مالک! میرے دل کے ان حوصلوں کو پورا کر دے تو پھر میں تیرے حضور میں مسکراتی ہوئی چلی آؤں گی' مجھے کوئی غم نہ ہو گا .... میری بے چینیوں کو قرار آ جائے گا تو میں بڑے سکون کے ساتھ مر سکوں گی۔"

وقت یوں ہی گزرتا رہا اور شبانہ بیگم کا مرض بھی کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا۔

آصف ماں کی طرف سے لاپرواہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں وقت ڈاکٹر کو لا کر ماں کو دکھاتا۔ بازار سے جا کر ان کی دوائیں لاتا۔ خود اپنے ہاتھوں سے ماں کو دوا پلاتا اور فرصت کے

لمحات میں ماں کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔

عاصمہ بھی ماں کی طرف سے بے حد فکرمند تھی۔ رات جیسے تیسے وہ ماں سے دور رہ کر گزار دیتی' لیکن صبح ہوتے ہی وہ ثاقب کے آفس جانے کے بعد عاصم کو ساس کے پاس چھوڑ کر ماں کے پاس آ جاتی اور تمام دن ان کو بہلانے کی کوشش کرتی رہتی۔

آج جب وہ ماں کے پاس آئی تو شبانہ بیگم آنکھیں بند کئے اپنے بستر پر بے سدھ پڑی تھیں۔ عاصمہ نے دروازے پر رک کر ماں کے چہرے کا جائزہ لیا تو تڑپ اٹھی۔ ماں کی حالت کس قدر نازک نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے بکھرے ہوئے بال اجڑی بہاروں کی نشاندہی کر رہے تھے۔

اسے ماں کو اس حالت میں دیکھ کر بڑا اذیت ناک صدمہ ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی ماں کے چہرے کو تکتی رہی پھر دبے قدموں ان کے قریب آ گئی۔ کرسی گھسیٹی تو شبانہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں۔ بیٹی کو قریب پا کر بولیں۔

"تم کب آئیں؟" ان کی آواز میں کتنا درد تھا۔ آنکھوں میں کیسی حسرت ناک ویرانی نظر آ رہی تھی۔

"ابھی ابھی آئی ہوں امی جان!" عاصمہ نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"عاصم کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"جی ہاں' خدا کا شکر ہے۔"

"ثاقب نہیں آئے کل سے۔"

"دفتر میں کام زیادہ تھا۔" عاصمہ بولی۔ "آپ کو سلام کہلوایا ہے آج آئیں گے۔"

"خدا اس کو سلامت رکھے۔ بڑا نیک لڑکا ہے۔"

"آپ نے دوا پی لی۔" عاصمہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" شبانہ بیگم نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"دوا سے لاپرواہی کریں گی تو بھلا اچھی کیسے ہوں گی۔" عاصمہ نے کہا' پھر اٹھ کر ماں کو دوا دی۔

شبانہ بیگم نے اولاد کی خوشی کی خاطر کڑوی کسیلی دوا حلق کے نیچے اتاری۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئیں۔

"امی جان! میرا خیال ہے کہ آپ کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ اس ڈاکٹر کے

علاج سے تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔"

"ثاقب کہہ رہے تھے کہ میں ہسپتال میں داخل ہو جاؤں۔" شبانہ بیگم نے نحیف سی آواز میں کہا۔ "میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی' لیکن وہ برابر اصرار کر رہے ہیں۔"

"ان کا خیال ہے کہ ہسپتال میں آپ کی دیکھ بھال بہتر طور پر ہو سکے گی۔"

"میں اسے زیر بار نہیں کرنا چاہتی بیٹی! پہلے ہی اس غریب کے ہمارے اوپر بہت سارے احسانات ہیں۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھی ماں کی کمزوری کا اندازہ لگاتی رہی۔

"آصف بھی یہی کہتا ہے کہ میں ہسپتال میں داخل ہو جاؤں۔ میں نے اخراجات کی بات کی تو کہنے لگا کہ وہ دفتر سے کچھ پیشگی لے لے گا۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔"

"میں اپنی وجہ سے آصف کو مقروض نہیں کرنا چاہتی بیٹی!"

"آپ کی زندگی ہمارے لئے زیادہ قیمتی ہے۔ پیسوں کی فکر نہ کیجئے۔"

"مجھے ہسپتال سے ویسے بھی ہول آتا ہے۔ گھر پر زیادہ سکون ملتا ہے۔"

"گھر پر آپ دوائیں بھی تو نہیں پیتیں؟" عاصمہ نے کہا۔ "ہسپتال میں کم از کم دوائیں تو وقت وقت سے ملتی رہیں گی۔"

"دواؤں کو مفت میں ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟" شبانہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا تو عاصمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"مایوسی کی باتیں نہ کیجئے امی جان! خدا نے چاہا تو آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔"

جواب میں شبانہ بیگم نے بیٹی کو غور سے دیکھا۔ کچھ کہنے کے لئے ان کے کمزور ہونٹ کپکپائے پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہیں۔

"کیا بات ہے امی جان! آپ ہر وقت کیا سوچا کرتی ہیں؟"

"کچھ نہیں عاصمہ بیٹی! کمزوری کی وجہ سے زیادہ باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا.........."

"ہنسا بولا کیجئے طبیعت بہل جائے گی۔"

"اچھا۔" شبانہ بیگم نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے جواب

دیا' پھر بولیں۔ "کبھی کبھی عاصم کو بھی لے آیا کرو' بڑا بھولا اور پیارا بچہ ہے۔ اسے دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔"

"کل ضرور لاؤں گی۔"

دوپہر کو آصف دفتر سے جلدی آ گیا تو سب نے مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ عاصمہ نے ماں کے لئے دلیہ پکایا تھا' لیکن شبانہ بیگم نے تھوڑا سا کھا کر چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر ٹال گئیں کہ بھوک نہیں ہے۔ کھانے کے بعد آصف بھی بہن کے پاس بیٹھ گیا۔

"آج تم جلدی کیسے آ گئے؟" عاصمہ نے بھائی سے پوچھا۔

"دل گھبرا رہا تھا آپی! اس لئے چھٹی لے کر چلا آیا۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی ہاں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

عاصمہ نے ماں کی وجہ سے آصف کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ماں کے سرہانے بیٹھی آہستہ آہستہ ان کا سر دباتی رہی۔ شبانہ بیگم کروٹ لئے لیٹی عاصمہ اور آصف سے باتیں کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو عاصمہ نے کہا۔

"جا کر دیکھو آصف کون آیا ہے۔"

آصف خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ دبا ہوا تھا۔

"کس کا خط ہے آصف؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"رجسٹری ہے آپی!" آصف نے ماں کی طرف دیکھا' پھر لفافہ بہن کی طرف بڑھا دیا۔

"رجسٹری کہاں سے آئی ہے؟" شبانہ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا' نہ جانے کیوں ان کا دل آپ ہی آپ دھڑک اٹھا تھا۔

عاصمہ نے لفافہ لے کر اس پر بھیجنے والے کا پتہ دیکھا تو اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ شیخ عارف کا پتہ دیکھ کر اس کی نگاہوں کے سامنے ماضی کے دھندلکے روشن ہو کر پھیلتے چلے گئے۔ ماں کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافہ کھولا۔ پھر اس میں سے نکلنے والے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی' جو کوئی قانونی دستاویز دکھائی دے رہے تھے۔ ان کاغذات کے ساتھ عارف علی کا ایک خط بھی شبانہ بیگم

کے نام موجود تھا۔ انہوں نے بیوی کو لکھا تھا............

"مظلوم شبانہ

ہمیشہ خوش رہو!

آج ایک طویل مدت کے بعد تمہیں مخاطب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گی۔ تمہاری خفگی اپنی جگہ مناسب بھی ہے۔ اسی لئے میں نے تم کو از خود مظلوم کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ایک عرصے سے تمہیں خط لکھنے کی جسارت کر رہا تھا' لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ مجھے اس بات کا خوف تھا کہ کہیں تم کو میری جسارت بھی ناگوار نہ گزرے' لیکن آج میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لوں۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور تمہاری وفاؤں کو فراموش کر کے اب تک جس حال میں رہا ہوں وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔ میری خطائیں اور میرے گناہ اس قابل تو نہیں ہیں کہ تم انہیں فراموش کر دو' لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک موہوم سی امید ہے کہ تم میرے اس آخری وقت میں مجھے معاف کر دو گی' تاکہ میں اس اذیت سے چھٹکارا پا سکوں جو مجھے زمانے کے ہاتھوں نے بخشی ہے اور جس میں میرا اپنا ہاتھ بھی ہے۔

خط کو طویل کر کے میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں' قدرت نے مجھے میرے گناہوں کی کیا سزا دی ہے' اس کا اندازہ صرف اس گھر کے در و دیوار لگا سکتے ہیں۔ جہاں آج بھی تمہاری وفاؤں کے نقش موجود ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں زندگی کی شدید تلخیوں سے دوچار ہوں۔ کم از کم اس طرح مجھے اس بات کا احساس تو ہو گیا کہ تم پر اس عرصے میں کیا کیا نہ بیتی ہو گی۔

"شبانہ! میں تمہارا مجرم ہوں۔ تمہارا خطاوار ہوں اور تمہاری وفاؤں سے پُرامید بھی ہوں کہ تم اپنے اس ذلیل شوہر کو معاف کر دو گی جس نے تمہیں پریشانیوں سے دوچار کیا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں شبانہ کہ میں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے۔ تم کو اذیت ناک احساسات کا شکار کیا ہے۔ میں مانتا ہوں

کہ حالات کے بھنور میں پھنس کر میں اندھا ہو گیا تھا' برے اور بھلے کی تمیز نہ کر سکا تھا۔ ہیرے اور پتھر کا فرق تو اب معلوم ہوا ہے جب قدرت کی بے آواز لاٹھی نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے اور زندگی کی تمنا بھی مجھ سے چھین لی ہے۔ شاید میں اس سے بھی زیادہ سخت سزا کا مستحق ہوں۔

"ہاں شبانہ! مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھا دینے کا آرزومند ہوں' جس نے تمہاری زندگی میں اندھیرا کر دیا تھا۔ میں اب اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ تمہارے قدموں پر سر رکھ کر سکون کی موت مر سکوں' لیکن پھر بھی ایک بھکاری کی حیثیت سے تم سے درخواست کر رہا ہوں کہ اگر ممکن ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا تاکہ مرنے کے بعد کم از کم میری روح کو قرار آ جائے۔ بولو شبانہ! کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟

ایک التجا اور کروں گا۔ اگر ہو سکے تو عاصمہ اور آصف سے بھی کہنا کہ وہ اپنے بدنصیب اور ظالم باپ کو معاف کر دیں۔ یہ میری بدنصیبی ہی تو ہے شبانہ کہ میں عاصمہ کی خوشیوں میں شریک نہ ہو سکا۔ آصف کو کبھی اولاد کہہ کر مخاطب نہ کر سکا۔ نواسے کو ایک نظر دور سے بھی نہ دیکھ پایا۔ شاید یہ میرے گناہوں کی سزا ہے جو مجھے قدرت کی طرف سے مل رہی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ سزا بہت کم ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں کبھی آصف کو بیٹا کہہ کر پکارتا اور وہ نفرت سے میرے منہ پر تھوک دیتا۔ عاصمہ کو بیٹی کے مقدس رشتے کا احساس دلاتا اور وہ حقارت سے مجھے دھتکار دیتی۔ نواسے کو گود میں لینے کی کوشش کرتا تو خوف سے چیخ مار کر مجھے اس بات کا احساس دلاتا کہ مجھے اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں ایک ایسا باپ ہوں جس سے صرف اولاد ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو نفرت کرنی چاہئے۔ میرا انجام تو یہ ہونا چاہئے کہ میں موت کی تمنا کروں تو موت بھی مجھے پناہ دینے سے انکار کر دے۔ میں جس راہ سے گزروں' لوگ مجھے نفرت سے گالیاں دیں' مجھے ٹھوکر ماریں۔ مجھے اس بات کا احساس دلاتے رہیں کہ میں نے ایک وفاشعار بیوی اور ایک خدمت گزار عورت کی عظمتوں کو

صدمہ پہنچا کر کس قدر ظلم کیا ہے۔

معاف کرنا شبانہ! میں شاید خط کو طویل کر کے تمہاری پریشانیوں میں اضافہ کر رہا ہوں۔ میں نے جب تمہاری وفاؤں سے منہ پھیر لیا تھا تو اب مجھے کیا حق ہے کہ اس قدر اپنائیت سے تمہیں مخاطب کروں یا اپنے ظلم کی روئیداد سنا کر تمہاری پریشانیوں میں اضافہ کروں۔ اس لئے اب خط ختم کر رہا ہوں۔ ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر اور تمہاری عظمتوں کے سامنے جھولی پھیلا کر تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔ عاصمہ اور آصف سے بھی کہنا کہ وہ اپنے منحوس باپ کو معاف کر دیں۔

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں عاصمہ اور آصف کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ اس لئے مرنے سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھ کر بھجوا رہا ہوں میں نے اپنی تمام دولت اپنے مظلوم بچوں کے نام کر دی ہے۔ ان سے کہنا کہ باپ کی اس آخری اور حقیر خواہش کو حقارت سے ٹھکرانے کے بجائے ایک بدنصیب کا نذرانہ سمجھ کر قبول کر لیں۔ قصرِ شبانہ تمہارے نام کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد تم یہاں چلی آنا تاکہ اگر کبھی میری روح بے چین ہو کر تمہیں تلاش کرے تو اسے مایوسی نہ ہو .... یہ میری آخری تمنا ہے۔ شبانہ! امید ہے تم اسے ٹھکراؤ گی نہیں .... اچھا خدا حافظ!

تمہارا خطاوار بدنصیب

عارف علی

شبانہ بیگم دھڑکتے ہوئے دل سے عاصمہ کے چہرے کو تکے جا رہی تھیں۔ خط ختم کرنے کے بعد عاصمہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے شبنمی قطرے جھلملائے تو وہ بے چین ہو گئیں۔

"کس کا خط ہے بیٹی!"

"ابا جان کا.........." اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ آج اس میں نفرت کا احساس نہیں تھا۔

"کیا لکھا ہے؟" شبانہ بیگم نے تڑپ کر پوچھا۔ زندگی کی تمام حسرتیں جیسے سمٹ کر

ان کی آنکھوں میں سماگئی تھیں۔

"لو آصف! تم پڑھ کر سنا دو۔" عاصمہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر لرزتے ہاتھوں سے خط آصف کی طرف بڑھا دیا۔

آصف نے بہن سے خط لے کر پڑھنا شروع کیا۔ شبانہ بیگم کی نظریں آصف پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے مضمون آگے بڑھتا گیا ان کی بے چینی بڑھتی گئی۔ دل کی دھڑکنیں انتہا کو پہنچ رہی تھیں۔ پھر خط ختم ہوا تو ان کی ویران آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ عاصمہ نے ماں کو روتے دیکھا تو خود بھی ان کے سر پر ماتھا ٹیک کر پھوٹ پڑی۔ آصف کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو اس کے دامن میں جذب ہوتے رہے۔ کمرے میں موت کا سماں طاری تھا صرف آہیں اور سسکیاں ابھر رہی تھیں۔

ایک وفا شعار عورت کی سسکیاں.........

ایک خدمت گزار بیوی کی آہیں.........

ایک بیٹی کی آہ و بکا.........

ایک بیٹے کے سہمے ہوئے آنسو.........

اور جب دل کے غبار چھٹے تو شبانہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں عاصمہ سے کہا۔

"بیٹی! کیا اب بھی تم اپنے باپ کے گناہوں کو معاف نہیں کرو گی؟"

"امی جان!" عاصمہ نے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر ماں کو لپٹا لیا۔

"انسان اگر سچے دل سے معافی مانگے تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے بیٹی!" شبانہ بیگم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ تو پھر بھی تمہارے باپ ہیں۔"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں کے سینے پر سر رکھے سسکتی رہی۔

"انہیں ہماری نفرت سے زیادہ ہماری محبت کی ضرورت ہے بیٹی!" شبانہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے آج تک تم لوگوں کی خوشی کی خاطر کبھی اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن مجھے تمہارے باپ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اپنی جنت سے بھلا کون نفرت کرے گا۔"

"امی جان!" عاصمہ نے ماں کے لہجے میں درد اور کسک کی آمیزش محسوس کی تو جلدی سے بولی۔ "آپ اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی کوشش کیجئے ورنہ آپ کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔"

"میری صحت کو دواؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کی خاطر دوائیں پی لیتی ہوں لیکن تم ابھی بچی ہو۔ یہ نہ سمجھ سکو گی کہ میرا روگ اور میری بیماری دواؤں سے دور نہیں ہو سکتی۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں امی جان!"

"اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم دونوں اپنے باپ کی خطاؤں کو معاف کر دو۔"

عاصمہ کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کی بات کا کیا جواب دے۔ اسے باپ کے بخشے ہوئے سارے صدمے یاد تھے۔ ماضی کی خلش اس کے سینے پر زخم بن کر رہ گئی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں ماں کی جھیلی ہوئی مصیبتوں کے نقش اتنے گہرے پڑ گئے تھے کہ وہ انہیں آسانی سے نہیں مٹا سکتی تھی۔ گنگ سی بنی ماں کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسیوں کو تکتی رہی' جس میں آج حسرتوں کا رنگ بھی جھلک اٹھا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو عاصمہ! تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

"میں آپ کے حکم سے کبھی باہر نہیں ہو سکتی امی جان!" عاصمہ نے ماں کا دل رکھنے کی خاطر جلدی سے کہا۔

"جیتی رہو بیٹی! تم نے آج میرے غموں کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔"

شبانہ بیگم کے چہرے پر خوشیوں کے ہزاروں چراغ جل اٹھے۔ یوں لگا تھا جیسے بادل چھٹ گئے ہوں اور دن کا اجالا پھیل گیا ہو۔

عاصمہ نے ماں کے چہرے پر زندگی کو مسکراتے دیکھا تو اس کے احساسات کو ایک انجانا سا دھچکہ پہنچا۔ وہ حیرت سے سوچنے لگی.........

کیا ماں کی خوشیوں کا تعلق آج تک عارف علی کی یاد سے وابستہ رہا ہے.........؟

کیا انہیں شوہر کی بے وفائیوں کا کوئی صدمہ نہ تھا.........؟

کیا ان کی بیماری دواؤں کے بجائے شوہر کی ایک نگاہِ کرم کی محتاج تھی.........؟

اگر نہیں' تو پھر انہوں نے ماضی کی تلخیوں کو اتنی جلدی فراموش کیوں کر دیا.........؟

بیمار چہرے پر زندگی کی کرن کیوں پھوٹی تھی.........؟

زرد زرد ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ کیوں ابھر آئی.........؟

درد کا درماں اتنی جلدی کیسے ہو گیا تھا.........؟

یہ کیسا طلسم تھا.......... کیا راز تھا.......... کون سا جذبہ تھا جس سے وہ آج تک ناواقف تھی..........؟

☆======☆======☆

شفق کی سرخیاں مدھم پڑ گئیں تو اندھیروں نے اپنا دامن پھیلانا شروع کر دیا۔ ماحول پر ایک سوگوار سی خاموشی طاری ہونے لگی۔

عارف علی اپنے کمرے میں بیٹھے شبانہ بیگم کی تصویر کو گھور رہے تھے۔ آج ان کی آنکھوں میں کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں تھی۔ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ کمرے میں ملگجی اندھیرا پھیلنے لگا تو انہوں نے اٹھ کر بتی جلائی پھر اپنے خیالات میں گم پشت پر ہاتھ باندھے آہستہ آہستہ کمرے کی محدود حدوں میں ٹہلنے لگے۔ پیشانی پر کبھی کبھی کوئی شکن ایک لمحے کے لئے ابھرتی پھر غائب ہو جاتی..........

چہرے پر چھائی ہوئی گھمبیر سنجیدگی کسی ٹھہرے ہوئے طوفان کا پیش خیمہ نظر آ رہی تھی، جو کسی لمحہ بھی پھٹ پڑنے کو بے چین تھا۔ بہت دیر تک وہ یونہی لٹے ہوئے جواری اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح ٹہلتے رہے۔ پھر بیوی کی تصویر کے سامنے آ کر رک گئے۔ کچھ دیر خاموش کھڑے اسے تکتے رہے پھر ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"شبانہ! دل کا درد آج ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ میری تنہائیاں مجھے ڈس لینے کو بے قرار ہیں۔ گھٹن کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور ان دکھوں کے علاج کے لئے مجھے صرف تمہاری مسیحائی کی ضرورت ہے، لیکن تم .... تم اپنی جگہ حق بجانب ہو شبانہ! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو ظلم کیا ہے اُس کی سزا بہت زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ شاید موت کی تلخی بھی میرے کچلے ہوئے احساسات کی شدت کو کوئی سکون نہ دے سکے .... مجھے زندگی کے ہنگاموں سے اب نفرت ہو گئی ہے۔ میں تمہارے بغیر زندگی میں آج ایسا خلا محسوس کر رہا ہوں جسے شاید موت کا تصور بھی پُر نہ کر سکے۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں آج بھی تمہاری وفاؤں سے ناامید نہیں ہوا ہوں۔"

ملازم نے دروازے پر آ کر عارف علی کو مخاطب کیا تو وہ چونک پڑے گھوم کر ملازم کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں مخل ہونے کو منع کیا تھا۔" ان کے لہجے میں ناگواری کا احساس تھا۔

"کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ملازم نے دبی زبان میں کہا۔

"جا کر کہہ دو میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا.........."

"میں نے ٹالنے کی کوشش کی تھی سرکار! لیکن وہ کہتے ہیں کہ بہت ضروری کام ہے۔"

"اب جا کر کہہ دو کہ میں مر چکا ہوں۔" عارف علی جھلا گئے۔

"ایسا نہ کہئے سرکار!" ملازم کی نظریں نمناک ہو گئیں۔

"میں کہتا ہوں دور ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ صاحب آپ کے کوئی عزیزدار معلوم ہوتے ہیں۔" ملازم نے آہستگی سے کہا۔

"انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ کو صرف ان کا نام بتا دوں، اس کے بعد بھی اگر آپ نہ ملنا چاہیں تو پھر ٹھیک ہے۔"

"کیا نام بتایا ہے اس نے؟" عارف علی نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ دل کی گہرائیوں میں ایک موہوم سی امید نے سر ابھارا تھا۔

"آصف نام بتایا ہے سرکار!"

"آصف..........!" عارف علی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملازم کو جواب دیئے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتے کمرے سے باہر آ گئے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو اپنے خونِ جگر کو اپنا منتظر پا کر خوشی کی انتہا آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے چھلک پڑی۔ آگے بڑھ کر آصف کو سینے سے لگا لیا..........

"میرے بیٹے .... میرے آصف!"

آصف نے باپ کے سینے کی گرمی کو پہلی بار محسوس کیا تو وہ بھی رو دیا۔ دیر تک باپ بیٹے ایک دوسرے کی محبت کا اندازہ لگا کر آنسو بہاتے رہے۔ پھر آنسوؤں کا سیلاب تھما تو عارف علی نے شفقت آمیز نظروں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج میری خوشیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تمہارے آنے سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ شاید تم اس کا اندازہ نہ کر سکو گے۔"

آصف نے ڈبڈبائی نظروں سے باپ کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

"مجھے عبدل سے معلوم ہوا تھا کہ تم اب افسر بن گئے ہو۔"

"آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ابا جان!"

اولاد کے منہ سے پہلی بار "ابا جان" کا لفظ سن کر عارف علی کے جذبات میں ایک بار پھر ابال آ گیا۔ اولاد کو سینے سے لپٹا کر دوبارہ رونے لگا۔

"عاصمہ کا کیا حال ہے۔ وہ تو ٹھیک ٹھاک ہے؟" عارف علی نے آنسو پونچھ کر دھڑکتے ہوئے دل سے بیٹی کی خیریت دریافت کی۔

"آپی خیریت سے ہیں۔"

"تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟" عارف نے درد بھری آواز میں پوچھا۔ "سنا تھا کہ وہ بہت زیادہ بیمار ہیں۔"

"امی کی صحت بہت گر گئی ہے۔" آصف بولا۔ "مجھے انہوں نے ہی بھیجا ہے۔"

"کیا کہلوایا شبانہ نے؟" عارف علی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"آپ کو بلایا ہے.........."

جواب میں ندامت کے آنسو احساسِ جرم کی شکل میں عارف علی کی نگاہوں سے ڈھلکنے لگے! کچھ دیر تک وہ گنگ سے بنے کھڑے آصف کو دیکھتے رہے۔ پھر اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آئے۔ جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے۔ باہر آ کر کئی دنوں بعد اپنی گاڑی گیراج سے نکالی اور آصف کو ساتھ بٹھا کر اپنی روٹھی ہوئی خوشیوں کو منانے کے لئے اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

شبانہ بیگم کی پُرامید نظریں بہت دیر سے کھلے ہوئے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ عاصمہ ماں کے قریب بیٹھی ان سے باتوں میں مصروف تھی۔ ماں کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکتے دیکھ کر نہ جانے کیوں وہ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر ماں کی خوشیوں میں شریک ہو گئی تھی۔

آصف دروازے سے اندر داخل ہوا تو شبانہ بیگم نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ ان کی زندگی کے لئے بہاروں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ ان کے سہاگ کی خوشیاں آصف کے کھلے ہوئے چہرے پر دمکتی نظر آ رہی تھیں۔

"تمہارے باپ نہیں آئے؟" ان کے کپکپاتے ہونٹوں سے نکلا۔

"ابا جان باہر والے کمرے میں موجود ہیں۔" آصف نے مسرت سے لبریز لہجے میں کہا۔ پھر بہن کی طرف دیکھنے لگا۔

"انہیں اندر ساتھ کیوں نہیں لائے۔" شبانہ بیگم نے اپنی ساری قوت یکجا کر کے

پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابا جان نے کہا ہے کہ وہ آپی کے کہنے سے آپ کے سامنے آئیں گے۔"

"جاؤ عاصمہ۔ باپ کو اندر بلا لاؤ۔"

عاصمہ نے ماں کے لہجے کی بے چینی محسوس کی تو آہستہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھا' پھر دھڑکتے ہوئے دل سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

عارف علی نے بیٹی کو دیکھا تو نگاہوں میں خوشیوں کے سائے لہرا گئے۔ ایک قدم آگے بڑھایا پھر یوں ٹھٹک کر رک گئے جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔

عاصمہ باپ کے چہرے پر نظر جمائے کھڑی تھی۔ دونوں باپ بیٹی کئی لمحے ایک دوسرے کو اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے دیکھتے رہے۔ عارف علی کے دل میں بیٹی کو گلے لگانے کی حسرت تڑپ رہی تھی۔ عاصمہ کو یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ باپ نے قدم اس کی جانب بڑھا کر روک لئے تھے۔

بہت سے لمحات یوں ہی خاموشی سے گذر گئے۔ پھر عاصمہ نظر جھکائے آگے بڑھی اور باپ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

"عاصمہ۔" عارف علی نے بیٹی کی جھکی جھکی نظروں اور معصوم چہرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "کیا تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو میری بیٹی۔"

عاصمہ سر جھکائے کھڑی پلکوں کی اوٹ میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتی رہی۔

"میں باپ ہو کر بھی تم سے معافی کا طلب گار ہوں۔" عارف علی کے لہجے میں ندامت تھی۔

عاصمہ کی آنکھیں چھلک پڑیں..........

"تم اگر چاہو تو مجھے میری منزل تک پہنچا دو.......... اور .... اگر تمہیں منظور نہ ہو تو میں آج پھر.........."

"ابا جان.........." عاصمہ ضبط نہ کر سکی' دوڑ کر باپ کے سینے کی گہرائیوں میں سما گئی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔" عارف علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی خطاؤں کی معافی چاہتی ہوں اباجان ...." عاصمہ نے سسکتے ہوئے کہا۔
باپ کی آغوش میں آج اسے ایک انجانا مگر جانا پہچانا سکون مل رہا تھا۔

"نہیں بیٹی .... غلطی تمہاری نہیں بلکہ میری تھی جو میں نے تم لوگوں سے نگاہیں پھیرلی تھیں۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ میں بُرے اور بھلے کی تمیز بھلا بیٹھا تھا۔ قدرت نے میرے ساتھ بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ میرے گناہوں کی سزا تو........."

"اباجان........." عاصمہ جلدی سے بولی۔ "اندر چلئے امی جان آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

عارف علی بیٹی کے شانے پر ہاتھ رکھے دھڑکتے ہوئے دل سے دوسرے کمرے میں آئے تو شبانہ بیگم کی بے چین نگاہوں میں خوشیوں کے ہزاروں چراغ جل اٹھے تھے۔ آصف ماں کی پٹی کے پاس کھڑا باپ اور بہن کو ایک ساتھ دیکھ کر کِھل اٹھا تھا۔

"عاصمہ بیٹی!" عارف علی نے بیوی کو دیکھتے ہوئے عاصمہ سے کہا۔ "اپنی امی سے کہو کہ اب یہ بھی مجھے سچے دل سے معاف کردیں۔"

"خدا کے لئے میری وفاؤں کو شرمندہ نہ کیجئے۔" شبانہ بیگم نے کمزور دل کی ابھرتی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میرا خدا گواہ ہے کہ میں آپ سے کبھی ناراض نہیں رہی۔"

"یہ تمہاری عظمت کی دلیل ہے ورنہ میں تمہاری وفاؤں کا مستحق تو نہیں ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" شبانہ بیگم جلدی سے بولیں۔ "میں نے آج تک کبھی یہ نہیں سوچا کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔"

"پھر بھی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں........."

"تقدیر میں جو لکھا تھا پورا ہو چکا۔ پرانی باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔"

عارف علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تشکرانہ نظروں سے بیوی کو دیکھتے رہے اور عورت کی بلندیوں کا اندازہ لگاتے رہے۔

"آپ کھڑے کیوں ہیں اباجان' بیٹھئے نا۔" عاصمہ نے باپ سے کہا تو عارف علی خاموشی سے آگے بڑھ کر بیوی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

عاصمہ چائے بنانے کے لئے باہر چلی گئی تو آصف بھی کچھ سوچ کر کمرے سے باہر

آ گیا۔

"شبانہ۔" عارف علی نے تنہائی پاکر بیوی سے کہا۔ "جب تک تم مجھے معاف نہیں کردو گی میرے دل کو قرار نہیں آئے گا۔"

"مجھے گناہگار نہ کیجئے۔"

"میں نے تمہارے ساتھ بڑا ناروا سلوک کیا ہے۔"

"بھول جایئے ان باتوں کو۔" شبانہ بیگم بولیں۔ "مجھے آج جو خوشیاں نصیب ہو رہی ہیں وہی میرے لئے بہت کافی ہیں۔"

"تم اپنا علاج تو کرارہی ہونا۔"

"ہاں .... لیکن اب مجھے کسی اور مسیحا کی ضرورت نہیں ہو گی۔" شبانہ بیگم کے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔

عاصمہ چائے لئے کمرے میں داخل ہوئی تو شبانہ بیگم نے کہا۔

"بیٹی! جاکر عاصم کو لے آؤ' اور اگر ثاقب دفتر سے آگئے ہوں تو انہیں بھی ساتھ لے آنا۔"

"نہیں عاصمہ۔" عارف علی جلدی سے بولے۔ "تم ثاقب میاں کو نہ بلانا میں اپنے داماد کا استقبال قصرِ شبانہ کے دروازے پر کروں گا۔"

"نواسے کو دیکھ لیجئے۔ ماشاء اللہ بڑا صحت مند اور پیارا بچہ ہے۔"

"ہونا بھی چاہئے۔ میرا نواسہ جو ہے۔" عارف علی نے مسکرا کر کہا۔ پھر بولے۔

"خدا اس کی عمر دراز کرے' لیکن اسے بھی میں بعد میں دیکھوں گا۔"

"کیوں.........؟"

"اس وقت میں جلدی میں چلا آیا تھا۔" عارف علی نے کہا۔ "اگر عاصم میاں نے ہاتھ پھیلا دیا تو مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

شبانہ بیگم نے شوہر کو خوش دیکھا تو خود بھی مسکرا دیں۔ عاصمہ زیرِلب مسکراتی ہوئی چائے بنانے لگی.........!

☆======☆======☆

ثاقب کو دفتر سے آئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔

ننھے عاصم سے کھیلتے ہوئے وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ عاصمہ نے آج

واپسی میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عاصمہ کے دیر تک نہ آنے پر شاکی نہیں تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ شبانہ بیگم کی حالت خراب ہے۔ ممکن ہے عاصمہ کو ماں کی وجہ سے دیر ہو گئی ہو۔

ثاقب خود بھی شبانہ بیگم کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے انہوں نے ساس کو کبھی ماں سے کم نہیں سمجھا تھا۔ ان کی بیماری کی خبر خود ثاقب کو بھی پریشان کئے رہتی تھی۔ بارہا انہوں نے ساس کو اس بات کی پیش کش بھی کی تھی کہ وہ ہسپتال میں داخل ہو جائیں لیکن شبانہ بیگم ہر بار ٹال گئی تھیں۔ عاصمہ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ ماں کے سلسلے میں ان کا احسان نہیں لینا چاہتی۔ ثاقب کو اس جواب پر دکھ ہوا تھا' اس کے جذبوں کو ٹھیس پہنچی تھی' لیکن وہ خاموش ہو گیا تھا۔

زندگی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے خاموشی کو ایک زریں اصول جان کر اپنا لیا تھا۔ اس نے عاصمہ کے اُکھڑے اُکھڑے رویہ پر کبھی اسے سرزنش نہیں کی تھی۔ اس کے روکھے لہجوں پر کبھی باز پُرس نہیں کی تھی۔ کسی بات پر کبھی ٹوکا نہ تھا' لیکن ایک خلش تھی جو اسے پریشان کئے رہتی تھی۔ ایک سوال تھا جو بار بار ذہن میں کلبلا اٹھتا۔

عاصمہ مجھ سے دُور دُور کیوں رہتی ہے............؟

فاصلے گھٹتے کیوں نہیں............؟

اس وقت بھی عاصم کو گود میں لئے وہ انہی خیالات میں گم تھے کہ نسیمہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ ثاقب ماں کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ننھا عاصم فرش پر بکھرے رنگ برنگے کھلونوں سے بہل گیا تھا۔

"امی جان۔ عاصمہ کی امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا............؟"

"بڑھاپا سب سے بڑی بیماری ہے بیٹا۔" نسیمہ بیگم نے کہا۔

"عاصمہ کے دیر کرنے پر مجھے بھی پریشانی ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے ملازم کو بھیج کر معلوم کرایا تھا۔"

"کیا خبر ملی؟"

"شبانہ بیگم کی خوشیاں واپس لَوٹ آئی ہیں۔ خدا نے چاہا تو اب ان کے دُکھوں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں بے چاری نے۔"

"کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں' ملازم نے آکر بتایا ہے کہ آج شبانہ بیگم کے گھر شیخ عارف علی آئے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" ثاقب بولے۔ "خدا کرے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر سے جڑ جائیں۔"

"آمین۔" نسیمہ بیگم نے بڑے خلوص سے کہا۔ "مجھے تو شبانہ کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ خدا نے بڑی مدتوں بعد بیچاری کے دن پھیرے ہیں۔"

"اگر آپ کہیں تو میں بھی کھڑے کھڑے ہو آؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارا جانا مناسب نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ عارف علی کو شرمندگی کا احساس ہو۔ شاید اسی لئے شبانہ بہن نے بھی تم کو ابھی نہیں بلوایا۔"

"عاصمہ کو غالباً اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔"

"وہ آئے تو مکمل حالات معلوم ہوں گے۔"

"آپ خود سے کچھ نہ پوچھئے گا۔" ثاقب بولے۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی کسی مصلحت کی بنا پر یہ بات ہم سے پوشیدہ رکھنا چاہیں۔"

"اتنا میں بھی سمجھتی ہوں۔" نسیمہ بیگم نے کہا۔ "تم نے چائے پی لی۔"

"ابھی نہیں پی۔"

"میں ملازم سے کہہ کر چائے بھجواتی ہوں۔ عاصمہ کو ممکن ہے دیر ہو جائے۔"

"ساتھ ہی پی لوں گا امی جان۔ ابھی طلب بھی نہیں ہو رہی ہے۔"

"خدا نے چاہا تو اب شبانہ بہن کی بیماری بھی جاتی رہے گی اور عاصمہ کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔" نسیمہ بیگم بولیں۔ "اسے باپ کی طرف سے بے حد ملال تھا۔"

ثاقب نے کوئی جواب نہ دیا۔ ذہن ایک بار پھر عاصمہ کے اُکھڑے اُکھڑے برتاؤ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

نسیمہ بیگم چلی گئیں تو وہ فرش پر بیٹھ کر عاصم کو دیکھنے لگے جو کھلونوں کو ہاتھ میں پکڑنے کے لئے بے چین تھا۔ کچھ دیر تک ثاقب اس کی معصوم کوشش کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کھلونا اٹھا کر بچے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بچے کے چہرے پر کامیابی کی معصوم خوشی ابھری تو ثاقب کو ایک روحانی مسرت کا احساس ہوا' لیکن

دوسرے ہی لمحے وہ پریشان ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ انہوں نے بھی عاصمہ کو حاصل کرنے کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے تھے۔ کتنے پاپڑ بیلے تھے اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ عاصمہ کو پاکر ان کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی تھی' لیکن یہ خوشیاں کتنی مختصر ثابت ہوئی تھیں۔ انہوں نے عاصمہ کو خوش رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی' لیکن وقت کے ساتھ فاصلے بھی بڑھتے گئے۔ ایک خلیج تھی جو زندگی کے عظیم رشتوں کے درمیان حائل ہو گئی' جسے پُر کرنے کے لئے ثاقب نے انتھک کوششیں کی تھیں' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فاصلے بھی بڑھتے گئے۔ وہ کسی صورت بھی عاصمہ کو خوش رکھنے کے متمنی تھے انہیں معلوم تھا کہ اگر ڈور کو زیادہ کھینچا گیا تو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے اور اس ڈور کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے خواب بھی ٹوٹ کر بکھر جاتے!

آج جب نسیمہ بیگم نے انہیں بتایا کہ شبانہ بیگم کے اجڑے ہوئے گلشن میں پھر سے بہار لوٹ آئی ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے کہ کیا ان کا نخلِ امید کبھی ہرا نہ ہو گا۔ کیا زندگی کے وہ ارمان کبھی پورے نہ ہوں گے جنہیں انہوں نے طویل راتوں میں تنہا جاگ جاگ کر تھپک تھپک کر بہلایا تھا۔ کیا وہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے جو انہوں نے شادی سے پہلے دیکھے تھے۔

دروازے پر قدموں کی مانوس سی آہٹ پاکر ثاقب نے گھوم کر دیکھا تو عاصمہ سر جھکائے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گھمبیر سنجیدگی مسلط تھی۔ آنکھیں زیادہ رونے کی وجہ سے متورم نظر آ رہی تھیں اور ان متورم آنکھوں کو دیکھ کر ثاقب کا دل تڑپ اٹھا۔ بڑی آہستگی سے پوچھا۔

"امی جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے............؟"

"جی ہاں۔" عاصمہ کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم کچھ بجھی بجھی سی نظر آ رہی ہو' کیا بات ہے............؟"

ثاقب کے لہجے میں کس قدر خلوص تھا۔ کتنی اپنائیت تھی۔ عاصمہ نے بھیگی ہوئی دراز پلکوں کو اٹھا کر دیکھا' پھر نظریں جھکائے عاصم کے قریب بیٹھ گئی۔ ثاقب اسے مسلسل دیکھ رہے تھے۔ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا کر بولے............

"پریشان کیوں ہو عاصمہ۔ کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے۔"

"آپ نے چائے پی۔" عاصمہ نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا' نہ جانے

کیوں آج وہ خود کو ثاقب کے سامنے مجرم سمجھ رہی تھی۔ احساسات ڈانواں ڈول ہوئے جا رہے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات نے اس کے سوچنے کا انداز بھی بدل دیا تھا۔ اسے شدت سے یہ خیال بار بار بے چین کر رہا تھا کہ وہ اب تک ثاقب کے ساتھ جو کچھ کرتی رہی ہے وہ ظلم تھا۔ ناانصافی تھی!

"تمہارے بغیر میں چائے بھلا کیسے پی لیتا۔" ثاقب نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"اگر مجھے دیر ہو جاتی............؟"

"تو میں تمہارا انتظار کرتا............"

"کب تک؟" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"جب تک تم واپس نہ آجاتیں............"

عاصمہ کے دل کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر ثاقب کو دیکھا اور ان آنکھوں میں پیار کا جذبہ پاکر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ خاموشی سے اٹھ کر باہر گئی۔ خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر لائی۔ پیالیوں میں چائے انڈیلتے وقت اس کے ہاتھ بار بار کانپ رہے تھے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ نظریں اٹھا کر ثاقب کو دیکھے' لیکن ہر بار اپنی کوشش میں ناکام ہو گئی۔ پلکیں نوخیز پتیوں کی طرح کپکپا کر رہ جاتیں۔ چائے کسی نہ کسی طرح پی کر عاصمہ نے بچے کو اٹھا کر بڑی محبت سے پیار کیا۔ پھر اسے سینے سے لگائے ساس کے پاس آ گئی۔ بہت دیر تک وہ نسیمہ بیگم کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتوں سے خود کو بہلاتی رہی۔ جب رات آئی تو مجبوراً اسے پھر ثاقب کے پاس جانا پڑا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے کمرے میں قدم رکھا تو ٹھٹک کر رک گئی۔ ثاقب کھڑکی کے قریب کھڑے باہر خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عاصمہ کو وہ دن یاد آ گیا جب شادی کے بعد اس نے پہلی بار خلوصِ دل سے شوہر کی محبت کو آزمانے کی کوشش کی تھی' لیکن بعد میں دل برداشتہ ہو کر اپنے ماضی میں واپس لَوٹ گئی تھی............

لیکن آج............

آج ثاقب اس کے خیالات میں ایک نئے انداز سے چھایا ہوا تھا۔ اسے یوں تنہا دیکھ کر عاصمہ کو افسوس ہوا تھا۔ دبے قدموں آگے بڑھ کر اس نے عاصم کو مسہری پر آہستہ سے لٹایا پھر شرمندگی کے احساسات کو لئے چپکے سے ثاقب کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں تھیں' لیکن آج ان دھڑکنوں میں نفرت کا

احساس نہیں تھا۔ پیار کی ترسی ہوئی امنگیں تھیں جو دھڑکنوں کو سہارا دے رہی تھیں۔

بہت دیر تک وہ چپ چاپ کھڑی ثاقب کو دیکھتی رہی، جو چوکھٹ پر کہنیاں ٹیکے دُور آسمان پر دمکتے چاند کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے............

"ثاقب!" اس نے لرزتی آواز میں ثاقب کو پکارا۔

"تم کب آئیں............؟" ثاقب نے پلٹ کر عاصمہ کو دیکھا تو وہ شوہر کی نظروں میں سچی محبت کی پامال حسرتوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

"ثاقب!" اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"تم کچھ اداس ہو عاصمہ۔ میں تمہیں خوشیاں تو نہ دے سکا لیکن کیا تمہارے غموں میں شریک ہونے کے قابل بھی نہیں ہوں۔" ثاقب کے جملے میں درد ہی درد تھا۔

"مجھے کوئی غم نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ آنکھوں میں ندامت کا احساس آنسو بن کر چھلک اٹھا۔

"پھر۔ تمہاری پلکوں پر یہ شبنمی قطرے کیوں لرز رہے ہیں۔"

"ثاقب۔" وہ پلکیں جھکا کر بولی۔ "کیا آپ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں۔"

"نہیں تو۔ کس نے بہکا دیا تمہیں۔" ثاقب کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

"میں شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔" وہ ہمت کر کے بولی۔

"عاصمہ۔" ثاقب نے جذبات سے مغلوب ہو کر تیزی سے کہا۔ "خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو جس سے مجھے دکھ پہنچے۔"

"میں نے آج تک آپ کو بہت دکھ پہنچائے ہیں ثاقب۔"

"ایسا نہ کہو عاصمہ۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" ثاقب نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھا کر بولے۔

"میری ان نظروں میں جھانک کر دیکھو کیا ان میں تمہیں کوئی شکایت یا شکوہ نظر آ رہا ہے............"

"آپ کا دل بہت وسیع ہے ثاقب، لیکن............"

"لیکن کیا............؟"

"میں نے آپ کو بہت زیادہ پریشان کیا ہے۔"

"کیا تو ہے۔" ثاقب نے عاصمہ کو دیکھ کر شوخی سے کہا۔

"اسی لئے تو میں آج آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔"

"اگر میں معاف کرنے سے انکار کر دوں تو............"

"تو میں خود کو دنیا کی بدنصیب ترین عورت سمجھوں گی۔"

"اچھا۔ اگر یہ بات ہے تو جاؤ معاف کیا۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کسی حاتم سے واسطہ پڑا تھا............"

"ثاقب............"

عاصمہ نے رندھی آواز میں کہا۔ تشکرانہ نظروں سے ثاقب کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے کشادہ سینے میں سما گئی۔ ندامت کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہے تو ثاقب کے دامن کی کشادگی نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔

بہت دیر تک وہ ثاقب کے سینے پر سر رکھے روتی رہی۔ ثاقب اُسے تسلی دیتے رہے۔ اپنی باتوں سے اسے ہنسانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر پیار سے اس کے گالوں کو ہاتھ سے تھام کر اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"عاصمہ............"

"جی............"

"ایک بات پوچھوں............"

"پوچھئے............"

"سچ سچ بتاؤ گی............"

"پوچھ کر دیکھ لیجئے۔" عاصمہ نے بڑی سادگی سے کہا۔

"صرف اتنا بتا دو کہ تم مجھ سے دُور دُور کیوں رہتی تھیں............؟"

"وہ میری بھول تھی۔" عاصمہ دبی زبان میں بولی۔

"بھول کی سزا جانتی ہو............"

"میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں............"

"سچ............؟" ثاقب نے مسرت کے جذبے سے سرشار ہو کر شوخ نظروں سے عاصمہ کو گھورا تو اُس نے شرما کر گردن جھکا لی۔ ہونٹوں پر شرمیلا سا تبسم پھیلا ہوا تھا۔

ثاقب بڑی والہانہ نظروں سے عاصمہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے شرمانے کا انداز ثاقب کو بڑا پیارا لگا تھا۔ یوں جیسے پھولوں سے لدی شاخ لچک کر رہ گئی ہو۔ کئی لمحات یوں

ہی خاموشی سے گذر گئے‘ لیکن اس خاموشی میں بھی ہزاروں ارمان چھپے ہوئے تھے............

لاکھوں تمنائیں مچل رہی تھیں............

بے شمار آرزوئیں پنہاں تھیں............

ثاقب ایک خاموش بچاری کی طرح آج بھی عاصمہ کے حُسن میں محو تھے اور............

عاصمہ نظریں جھکائے یوں شرمائی شرمائی کھڑی تھی جیسے آج اسے ثاقب سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی............

جیسے آج اس نے ثاقب کو ایک نئے روپ میں دیکھا تھا۔

نیا روپ............

جس میں زندگی ہی زندگی تھی............

ثاقب بہت دیر تک پیار بھری نظروں سے عاصمہ کو دیکھتے رہے‘ جو آج اچانک ان کی زندگی پر بہار کے لطیف جھونکوں کی طرح چھا کر رہ گئی تھی۔

"عاصمہ۔" انہوں نے آہستہ سے پکارا۔

"جی۔" عاصمہ کے ہونٹ کپکپائے۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"میری طرف دیکھو............"

"اوں ہونہہ............"

"کیوں............"

"اس لئے کہ اب میں آپ سے پھر روٹھ گئی............"

"میری خطا کیا ہے............؟"

"یہی کہ آپ نے بنا کچھ کہے سنے مجھے معاف جو کر دیا............"

"میں تم سے ناراض ہی کب تھا............"

"پھر الگ تھلگ اور خاموش کیوں رہتے تھے۔" عاصمہ نے نظریں اٹھا کر ڈھٹائی سے پوچھا............

"مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تم مجھ سے زیادہ ناراض نہ ہو جاؤ۔"

"اوہ۔" عاصمہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "اگر میں سچ مچ آپ سے ناراض ہو جاتی تو آپ

کیا کرتے۔"

"یقین کرو گی............"

"یقین کرنے کی بات ہوگی تو ضرور کروں گی۔"

"اگر تم سچ مچ مجھ سے ناراض ہو کر دور ہو جاتیں‘ تو اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ختم کر لیتا............"

"ثاقب............" عاصمہ نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ثاقب کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ پھر مصنوعی غصے سے بولی۔ "وعدہ کیجئے کہ آئندہ آپ ایسی بُری فال منہ سے نہیں نکالیں گے۔"

"ایک شرط پر وعدہ کر سکتا ہوں............"

"کیا............؟"

"پہلے تم وعدہ کرو کہ مجھ سے اب کبھی ناراض نہیں ہو گی۔" ثاقب کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا۔

"وعدہ۔" عاصمہ نے جلدی سے اقرار کر لیا۔

"کبھی مجھ سے دُور دُور نہیں رہو گی۔"

"ٹھیک ہے............"

"مجھے دیکھ کر کبھی نفرت سے منہ نہیں پھیرو گی............"

"ثاقب!" ندامت کا احساس ابھرا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ثاقب کے کشادہ سینے سے جا لگی۔

"صرف اتنے سے ثبوت سے کام نہیں چلے گا............"

"میں اب ہر امتحان کے لئے تیار ہوں۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

"سوچ لو............ بعد میں بدل نہ جانا............"

"آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے؟" عاصمہ نے نظریں اٹھا کر ثاقب کو دیکھا پھر جلدی سے ہونٹ کاٹ کر نظریں جھکا لیں۔

ثاقب کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سچے پیار کی چمک موجود تھی اور آج اس چمک کی گہرائی کو محسوس کر کے اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ ایک انوکھا سا جذبہ بڑی آہستگی سے اس کے وجود پر چھاتا جا رہا تھا۔

"نظریں کیوں جھکالیں تم نے؟" ثاقب نے دبی زبان میں پوچھا۔

"نیند آرہی ہے۔" وہ شوخی سے مسکرادی۔

"ناممکن .... آج تم ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سو سکتیں۔"

"کوئی زبردستی ہے..........؟"

"ہاں.........." ثاقب کی سانسیں مہک اٹھیں۔ "تمہاری بھول کی کچھ تو سزا ملنی چاہئے' اور پھرابھی مجھے اپنی وفاؤں کا ثبوت بھی تو دینا ہے.........."

"زبان سے کہہ دیجئے' میں یقین کرلوں گی.........."

"کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دل کی زبان سے ادا کی جاتی ہیں.........."

"عاصم کیا سوچے گا؟" وہ شرما کر بولی۔

"ٹالنے کی کوشش کررہی ہو۔"

"یہ اتنے سمجھدار کب سے ہو گئے آپ؟" وہ بھرپور مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولی..........

"جب سے تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے پیار کی سچی چمک دیکھی ہے۔"

عاصمہ اس والہانہ انداز پر کٹ کر رہ گئی۔ مسکرا کر جانے کے لئے گھومی تو ثاقب نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت مضبوط کرلی اور شریر مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولے۔

"آج تو میں گن گن کر تم سے بدلہ لوں گا۔"

"میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھارہے ہیں.........."

"جو دل چاہے سمجھ لو.........."

"اور اگر میں پھر آپ سے ناراض ہو گئی تو!؟"

"اب یہ ناممکن ہے.........."

"اتنی جلدی بھروسہ ہو گیا آپ کو.........."

"ہاں .... میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اب تم مجھ سے کبھی نہیں خفا ہو گی۔"

"اس یقین کی کوئی وجہ؟"

"تمہارے دل کی دھڑکنیں اس بات کی گواہ ہیں.........."

"شریر کہیں کے۔" وہ تیزی سے ثاقب سے ہاتھ چھڑا کر پلٹی' پھر مسہری پر آکر سوئے ہوئے عاصم کو پیار کرنے لگی۔

"آج کوئی بہانہ کام نہ آئے گا۔" ثاقب نے شوخی سے کہا۔

"میں آپ سے بات نہیں کررہی ہوں.........."

"اچھا.......... اور ابھی جو اتنے سارے وعدے کئے تھے!"

"وہ .... وہ تو آپ کو بہلانے کے لئے تھے۔" عاصمہ شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔ پھراس نے عاصم کو دوبارہ چوم لیا۔

"میری حق تلفی کا بھی کچھ خیال ہے تمہیں۔" ثاقب نے قریب آکر کہا تو وہ شرما کر رہ گئی۔ چہرے کی سرخی کندن کی طرح دمک اٹھی۔

نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"منہ دھو رکھئے .... بڑے آئے حق جتانے والے۔"

"اب آپ کی مرضی چلنے کا وقت گزر گیا محترمہ!" ثاقب نے بڑی اپنائیت سے کہا؛

"آج سے صرف میری مرضی چلے گی۔ بہت عرصے تڑپایا ہے تم نے .... اب میری باری ہے.........."

"بڑے آئے کہیں سے مرضی چلانے والے۔" عاصمہ نے مسکرا کر گردن گھمالی۔

ثاقب نے عاصمہ کو یوں زیرِلب مسکراتے دیکھا تو ہنستے ہوئے آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ گئے۔ پھر جھک کر اس کے کان میں جانے کیا کہا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ چھپالیا اور چھوئی موئی کی طرح خود اپنے وجود میں سمٹ جانے کی کوشش کرنے لگی۔

ثاقب کچھ دیر تک اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر مدھم آواز میں پکارا..........

"عاصمہ..........!"

عاصمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میری بات بُری لگ گئی کیا؟" ثاقب نے پوچھا۔

"میں نہیں بولتی آپ سے۔" عاصمہ نے چپکے سے کہا اور پھر عاصم کو گھسیٹ کر سینے سے لگالیا۔

"کیا آج بھی تم میری خوشیوں کا احترام نہیں کرو گی؟"

"مجھے نیند آرہی ہے' آپ بھی سو جایئے۔"

"اور اگر نیند نہ آئے تو کیا کروں؟"

"میں کیا جانوں!" عاصمہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا' لیکن آج ان دھڑکنوں میں نفرت کا احساس نہیں تھا.............

آج ان میں آرزوئیں مچل رہی تھیں............

تمنائیں شامل تھیں............

مسرت کا احساس اُمڈ رہا تھا............

لطیف لطیف .... اور............

سحر آگیں ....

جن میں سچے پیار کے ساغر چھلک رہے تھے ....

عاصم کو سینے سے لگائے آنکھیں بند کئے وہ دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آج جیسے وہ ان مچلتے ہوئے ارمانوں پر قابو پانے سے قاصر تھی۔ آپ ہی آپ اپنے جذبات پر شرمائے جا رہی تھی۔

ثاقب خاموش کھڑے حُسن کی رعنائیوں کو دیکھتے رہے' پھر دبے قدموں پلٹے اور خواب گاہ میں روشن قمقموں کو بجھا دیا۔ باہر نیلے آسمان پر چمکتا ہوا چاند اپنی سیمیں کرنوں کو سمیٹ کر آہستہ سے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اور ....

جب رات کا فسوں ٹوٹا تو زندگی کا نیا سویرا بڑی آب و تاب سے طلوع ہو رہا تھا۔

☆====== ختم شد ======☆